قیمت : -/10 روپے

دسمبر 2009

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

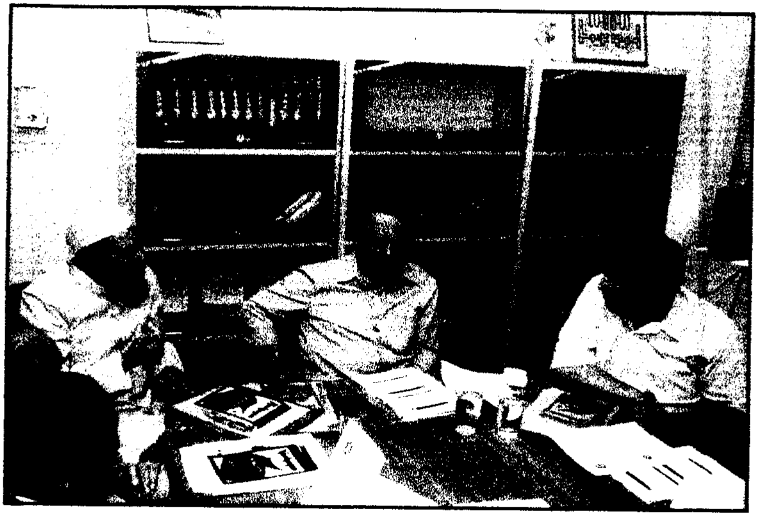

28 اکتوبر 2009 کو قومی اردو کونسل کے دفتر میں جناب پی اے انعامدار کی صدارت میں منعقدہ کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کے سپروائزروں اور ڈپارٹمنٹ آف الیکٹرونک اینڈ ایکریڈیشن آف کمپیوٹر کورس کے نمائندوں کی میٹنگ میں دائیں سے اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، جناب پی اے انعامدار (پونے) مولانا انیس الرحمٰن قاسمی (پھلواری شریف، پٹنہ) پروفیسر افشار عالم (نئی دہلی)

اسی میٹنگ میں دائیں طرف سے کونسل کی ٹیکنکل ایجوکیشن کمیٹی کے ممبران جناب شمیم خاں، محترمہ ہما، ڈاکٹر اے کے دویدی (چنڈی گڑھ)، جناب وجے کمار، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، جناب پی اے انعامدار، ڈاکٹر شاکر احمد یحییٰ (دربھنگہ)، پروفیسر افشار عالم، جناب مشتاق احمد پیر (سرینگر)، محترمہ مونا عابد اور محترمہ نور فاطمہ (گلبرگہ)

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

جلد۔11، شمارہ۔12، دسمبر 2009

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات .... ادارہ 4

زبان اور ادب

● سید احمد خاں اور بنارس .... یعقوب یاور 5

● انگریزی نظام تعلیم میں اردو نصاب کا مسئلہ .... اطہر فاروقی 12

● اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت .... خالد محمود 16

● خلیل الرحمٰن اعظمی کے تبصرے .... سرور الہدیٰ 19

● ذکرِ بتاں اور فکر جہاں کا شاعر: وامق جونپوری .... نشاط فاطمہ 26

کلاسیکی ادب

● حسن آرا کی بدمزاجی اور شرارت .... ڈپٹی نذیر احمد 28

● غزلیات .... شاہ مبارک آبرو 33

ذکرِ رفتگاں

● محمود ہاشمی کی یاد میں .... فیاض رفعت 34

کیریئر

● نئے پیشہ ورانہ کورسز میں کیریئر .... فاروق احمد درویش پوری 36

سائنس اور ٹیکنالوجی

● روایتی اور غیر روایتی توانائی .... اقبال محی الدین 40

● گلوب .... گری راج اگروال 43

ہماری مطبوعات سے

● سورج سے توانائی .... ایکن لارسن 45

● کلاسیکی تامل شلوک .... مترجم: غازی حمید اللہ خاں 48

یو این آئی اردو سروس .... ادارہ 51

اردو خبرنامہ .... ادارہ 56

تبصرہ و تعارف 69

● دوربین .... عارف عثمانی ....

● ہندوستان کی کہانیوں کا خزانہ .... عبدالرشید اعظمی ....

● عقل مند مچھیرا .... عائشہ شہناز فاطمہ ....

● موگمیا لوک کہانیاں .... وسیم اقبال ....

● بہار میں بچوں کا ادب (آزادی کے بعد) .... محمد نوشاد عالم

● جان پہچان (بچوں کے ادیبوں اور شاعروں سے انٹرویو) .... رئیس الدین رئیس ....

● دیگر کتب .... ادارہ ....

بچوں کا گوشہ

● نخلستان کو .... سید مجیب الرحمٰن 75

آپ کی بات

■ **محمد عبدالغفار شکیل، 51، 2nd مین، نزد پوسٹ آفس، میسور**

''اردو دنیا'' پڑھنے کو نہ ملے تو کو بڑی بے چینی اور تشنگی رہتی ہے۔ یہ رسالہ اسم با مسمیٰ رسم با مسمیٰ ہے اور بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہے خصوصاً NCPUL کے کاموں کی۔ آپ جو'' ہماری بات'' کے عنوان سے ہر ماہ لکھتے ہیں اسے میں غور سے پڑھتا ہوں جب میں کرناٹک اردو اکادمی کا چیرمین تھا تو اس کے ترجمان رسالے'' اظہار نو'' سلور جوبلی نمبر میں آپ کا ایک مضمون بعنوان'' ہماری بات'' کئی سال پہلے غالباً 2001 میں شائع کر چکا ہوں جو اردو دنیا میں شائع ہوا تھا اور مجھے بہت پسند آیا تھا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ان اداریوں میں سے چند جو آپ کو بے حد پسند ہوں منتخب کر کے کتابی شکل میں شائع کروادیں یہ ایک اہم دستاویز ہوگی۔

■ **اے۔ امیر النسا، 13، جمیل آباد، 2nd، میل وشارم۔ 632509**

میں'' اردو دنیا'' کی پرانی قاری ہوں ویسے بھی جن کا تعلق اردو ادب سے ہے ماہنامہ'' اردو دنیا'' ان کا ساتھی ہے۔ میرا تو یہ پسندیدہ رسالہ ہے۔

اکتوبر کے شمارے میں کے. وی. نکولن صاحب کا مضمون بعنوان'' تامل ناڈو کی اہلِ قلم خواتین'' نظر سے گزرا، جس میں میرا بھی ذکر آیا ہے۔ انتہائی مشکور ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ'' بند کتاب'' کے بعد میری اور تین تصانیف منظر عام پر آئیں! ارضِ مقدس میں چند روز ویسٹ ایشیا کا سفر نامہ انشا، کولکاتا میں قسط وار شائع ہوا پھر محترم ف. س. اعجاز مدیر/ انشا کولکاتا نے اسے کتابی شکل دی۔ اس کے بعد پاکستان کا سفر نامہ'' سرحد کے اس پار'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ گذشتہ ماہ'' مشعل راہ'' کے عنوان سے اصلاحی مضامین پر مشتمل کتابچے کا اجرا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر محمد رابع حسنی ندوی صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ نکولن صاحب نے جن افسانوں کا تذکرہ اپنے مضمون میں کیا ہے ان کی کاپیاں اگر ان کے پاس محفوظ ہوں تو مجھے درکار ہیں۔ میں اپنے افسانوں کا مجموعہ نکالنا چاہتی ہوں۔ میری غیر ذمے دارانہ فطرت کی وجہ سے میرے کئی افسانے میرے ریکارڈ میں نہیں ہیں۔

'' اردو دنیا'' کی نئی آب و تاب نظروں کو خیرہ کر رہی ہے۔ خدا کرے یہ آب و تاب ہمیشہ برقرار رہے۔ آمین۔

■ **ڈاکٹر حیات افتخار، صدر شعبہ اردو، قائد ملت کالج، میڈاواکام، چنئی**

آپ نے ماہنامہ'' اردو دنیا'' کے (اکتوبر 2009) کے شمارے میں ڈاکٹر شیخ صلاح الدین کا خط شائع کیا ہے، جس میں انھوں نے میرے مضمون '' علامہ اقبال اور سبرامنیم بھارتی (مطبوعہ جولائی 2009) کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کسی بھی مضمون کے متعلق رسالے کے قاری کو رائے زنی کرنے کا حق ہے لیکن یہ رائے معروضی اور ذمے دارانہ ہونی چاہیے کسی مضمون کے متعلق یہ لکھ دینا کہ اسے پڑھ کر تشنگی محسوس ہوئی کوئی معروضی رائے نہیں ہے۔ اس طرح کی رائے مختلف رسائل میں شائع ہونے والے اکثر و بیشتر مضامین پہ صادق آسکتی ہے کیونکہ رسائل کے مختصر صفحات میں کوئی بھی مضمون اس طرح نہیں لکھا جا سکتا کہ اس میں موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکے۔ تشنگی کا احساس ایک اضافی احساس ہے جو چیز آپ کو تشنہ محسوس ہو وہی چیز دوسرے کے لیے اطمینان بخش ثابت ہوسکتی ہے۔

تقابلی ادبی تنقید و تحقیق اردو میں اتنا فروغ نہیں پاسکی ہے جتنا کہ دوسری زبانوں میں۔ خصوصی طور پر ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادبیات کے ساتھ ہمارے ادب کا تقابلی مطالعہ خال خال ہی پڑھنے کو ملتا ہے البتہ ہندی اور دیگر زبانوں میں اس کو باقاعدہ تحقیق کا موضوع بنا کر یونیورسٹیوں کے بہت سے شعبوں میں یہ کام جاری ہے۔

میں نے مضمون میں اپنے موضوع کے حدود بیان کر دیے تھے کہ اس کا مقصد برصغیر کی دو عظیم زبانوں کے دو عظیم شاعروں کے ہاں بیسویں صدی کے اوائل میں ابھرنے والے قومی رجحانات کی جو بازگشت سنائی دیتی ہے اس کی نشاندہی کرنا ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے حاصل ہونے والا واحد تاثر یہی ہوگا۔ ایک مختصر افسانے کی طرح مختصر مضمون میں بھی وحدت تاثر کی ہی اہمیت ہوتی ہے۔ رہا سوال کسی تحریر کو شمارے میں شامل نہ کرنے سے شمارے کی صحت پر اثر نہ پڑنے کا تو اگر یہی بات میں کہوں کہ موصوف کا خط اس شمارے کے خطوط کے کالم میں شامل نہ کیا جاتا تو شمارے کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ تو کیا یہ بات ان کو ناگوار نہ گزرے گی۔؟

آپ اپنے مؤقر جریدے میں تمام ریاستوں کے اردو ادیبوں کو نمائندگی دینے کی سعی کرتے ہیں یہ بات نہایت ہی قابلِ تحسین ہے۔ ہوسکتا ہے بعض لوگوں کو یہ بات پسند نہ آتی ہو؟ آج اردو کو اس طرح کے متعصب لوگوں سے بچانا ہے۔ آپ کا ماہنامہ اور ادارہ دونوں تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر اردو زبان کے فروغ میں خلوصِ دل سے کوشاں ہیں اس کے لیے آپ اور آپ کی ٹیم واقعی مبارکباد کی مستحق ہے۔

■ **سکریٹری، مسلم لائبریری، نمبر 8 ویر پلے اسٹریٹ۔ بنگلور**

سب سے پہلے ہم آپ کو ڈائرکٹر کے عہدے پر دوبارہ فائز ہونے پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ کا یہ دور بھی شاندار رہے گا۔ دراصل دنیائے اردو، جہانِ اردو کو آپ جیسی ذہین، محنتی، دیانت دار شخصیت کی بڑی ضرورت تھی اور رہے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و

سلامتی عطا فرمائے رکھے۔

ماہنامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' ہمیں بڑی پابندی سے ملتے ہیں۔ یہ گہر ریز جریدے ہمارے ہاں بڑے مقبول ہیں اور ہم ان کا بڑے سلیقے سے ریکارڈ رکھتے ہیں۔

برا نہ مانیں تو ایک بات کہنے کی ہمت کرتا ہوں وہ یہ کہ دونوں جریدوں میں بہت کچھ ہوتا ہے لیکن ایک بات کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے وہ ہے ملک کی اردو لائبریریوں کا تذکرہ۔ اگر ان لائبریریوں کا ذکر سلسلہ وار ''اردو دنیا'' میں فرمادیں تو بہت خوشی ہوگی۔

میں اپنے اس لیٹر کے ہمراہ مسلم لائبریری، بنگلور کا لٹریچر منسلک کرتے ہوئے آپ سے عاجزانہ گزارش کرتا ہوں کہ اسے ''اردو دنیا'' میں شائع فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

■ عبدالغفار ثاقب، مفتی مدرسہ حمیدیہ، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ، (بہار)

پہلی بار ''اردو دنیا'' (شمارہ اکتوبر 2009 کی) بے شان و گمان زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ میری تساہلی یا ضیق الوقتی ہے کہ کوئی قابلِ اعتنا ہی پرچہ کیوں نہ ہو سرسری نظر کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے، جو میری بدذوقی کی علامت ہے، مگر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اس رسالے سے جو معلومات کے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق ہے، تشنگیِ ذوق بجھنے کی بجائے مزید بھڑکنے لگی۔ خلافِ عادت ایک ہی نشست میں تمام مشمولات پر عقابی نظریں دوڑ گئیں۔ دوبارہ مصروفیات سے کچھ وقت عاریتاً لے کر اردو خبر نامہ کے تراشوں کی ناؤ میں بیٹھ کر دور دراز اردو ٹھکانوں کی سیر پر نکل پڑا۔ ذہن و فکر میں بالیدگی اور معلومات میں اضافہ ہوتا رہا۔ خصوصاً اقبال محی الدین اور شمیم احمد صدیقی کے معلوماتی مضامین ''زراعت میں جنیٹک کی اہمیت'' اور ''خود پروردہ قاتل'' نے کافی محظوظ کیا۔۔ بڑی بے انصافی ہوگی اگر رجب علی بیگ سرور کے مسجع و مقفیٰ 'قصۂ جان عالم اور انجمن آرا' کے تلخیص و تسہیل کار پروفیسر حنیف نقوی کا ذکر نہ کروں، جنھوں نے نہایت ہنرمندی کا جوہر دکھایا ہے۔ یونہی محمد حسن کا تحقیقی جائزہ ''مہاراشٹر میں اردو تعلیم'' نے حیرت زدہ کر دیا کہ جہاں اردو کی انجمن بارونق ہونی چاہیے وہاں وہ تعصب انگیز گھاٹی سے گزر رہی ہے مگر دوسرے علاقوں میں پھل پھول رہی ہے، جو خوش آئند خبر ہے۔ کم و بیش سبھی قلم کار اچھے لگے، مگر اس علمی و معیاری مجلے میں ''بچوں کا گوشہ'' نام ہی ''مخمل پر ٹاٹ کا پیوند'' لگتا ہے۔ اس لیے کہ یہ بازیچۂ طفلاں نہیں ہے۔ میرے خیال سے اس جگہ پر کوئی دوسرا معلوماتی گوشہ بہتر رہے گا۔

■ شاغل ادیب، زیب منزل، صدیق نگر، مشیر آباد، حیدرآباد۔500048

''اردو دنیا'' بابت ماہ اکتوبر، 2009 باصرہ نواز ہوا۔ ''زبان و تعلیم اور ''ادب و صحافت'' دونوں ابواب میں شامل تمام مضامین بہت اچھے ہیں اور قارئین کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن محمد حسن صاحب کے مضمون ''مہاراشٹر میں اردو تعلیم'' کے تعلق سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے شہر شولا پور کا کہیں تذکرہ نہیں کیا۔ مہاراشٹر میں اردو تعلیم کے اعتبار سے مالیگاؤں، اورنگ آباد، بھیونڈی، ناگپور اور پونے کے ساتھ شولا پور کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں کے ایس.ایس.سی کے اردو میڈیم کے ایک طالب علم تنویر نے پوری ریاست میں امتیازی کامیابی حاصل کر کے اپنے اسکول اور اپنے شہر کے نام کو روشن کیا تھا۔ اسی طرح، کے.وی. نکولن کے مضمون ''تمل ناڈو کی اہل قلم خواتین'' میں بھی چند نام شامل نہیں ہو سکے ہیں۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں مدراس ''اب چنئی'' سے شائع ہونے والے ادبی رسائل میں ماہنامہ پاکیزہ اور اس کی مدیرہ کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ کلاسیکی ادب اور ''رفتگاں'' کے مشمولات قابلِ صد ستائش ہیں۔

■ ڈاکٹر عاقل انصاری، اسلام باغ، شیخ سرائے، سیتا پور (یو. پی)

''اردو دنیا'' سے استفادہ کا موقع برابر ملتا رہتا ہے۔ درجات جامعہ کے طلبہ اور ریسرچ اسکالرس کے لیے اس کی افادیت مسلم ہے۔ ایم.اے اور پی.ایچ.ڈی کرنے والوں کے لیے ''اردو دنیا'' اور قومی کونسل کے سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' میں کثرت سے تحقیقی مقالات چھپتے ہیں۔ ان رسالوں سے ریسرچ کرنے والے حضرات کو رابطہ رکھنا چاہیے۔ ایسے ادارے جن میں اردو کی درس و تدریس کا انتظام ہے یا اردو ٹیچرس خواہ وہ کسی درجے کے معلم ہوں۔ ایسے معلوماتی رسالے اسکول اور جیب فنڈ سے منگانے اور مطالعے میں رکھنے چاہئیں۔

اردو دم توڑ رہی ہے، اردو قارئین گھٹ رہے ہیں، اردو کا روزی روٹی سے رشتہ ختم ہو چکا ہے، اردو رسم الخط کی تبدیلی ضروری ہے، عربی مدارس و مکاتب ہی اردو کی بقا کے ضامن ہیں، یا اردو صرف مشاعروں کی وجہ سے زندہ ہے، جیسے مفروضات جو عام ذہنوں میں کلبلاتے رہتے ہیں، معیاری جریدے پڑھنے کے بعد ان کی منفی سوچ میں تبدیلی یقینی ہے۔ ''اردو بک ریویو'' اور ''اردو دنیا میں ماہ بہ ماہ نئی کتابوں کی اشاعت اور آمد کی فہرست شائع ہوتی ہے۔ جامعات اور یونیورسٹیوں میں کس طور پر تحقیق کا کام ہو رہا ہے ان کی سرگرمیوں کی رپورٹیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو کی ٹھوس خدمت انھیں کے ذریعے ہو رہی ہے، تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔

■ ایم. عزیز احمد باشا، ڈیزائنر، امیر النسا بیگم گلی، چینئی

اردو زبان کی ترقی کے لیے میری رائے یہ ہے کہ گھروں میں بچے اور دیگر افراد اردو میں گفتگو کریں اور ٹی.وی پر اردو پروگرام کثرت سے دیکھیں، اردو اخبار پڑھیں اور بچوں کو بھی پڑھائیں تاکہ اردو ان کی اپنی ایک ضرورت بن جائے۔ جیسے ایک فرد سے خاندا، ایک خاندان سے ایک کنبہ اور ایک کنبہ سے ایک قوم بن جاتی ہے۔ اسی طرح سے اردو زبان صرف ایک فرد کی نہیں، اردو صرف دہلی یا لکھنؤ کی زبان نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کی زبان ہے۔ اس لیے سبھی کو اس کے فروغ کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہماری بات

11 نومبر ہندوستان کی جنگ آزادی کے سپہ سالار اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی تاریخ پیدائش ہے۔ اس تاریخ کو ہر سال مولانا کی یادوں کو تازہ کیا جاتا ہے اور انھوں نے ملک وقوم کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، ان کا اعتراف کیا جاتا ہے۔

اس سال 11 نومبر کو مولانا آزاد کے 131ویں یوم پیدائش پر کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی حیدرآباد کے زیر اہتمام نئی دہلی کے آندھرا پردیش بھون میں اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں پورے ملک سے 361 مندوبین نے شرکت کی اور مرکزی وزرا جناب کپل سبل، جناب غلام نبی آزاد اور جناب سلمان خورشید کی موجودگی میں اردو کی ترقی، تعلیم، اتحاد، قومی یک جہتی، سیکولرازم اور باہمی رواداری کو فروغ دینے کا حلف لیا۔

اس موقع پر مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب کپل سبل نے اپنی خیال انگیز تقریر میں جو باتیں کہیں وہ مولانا آزاد اور ان کے مشن کے تئیں ان کے گہرے تعلق خاطر کا بھی اظہار تھیں، ملک کو درپیش تعلیمی چیلنجوں کے تئیں ان کی فکرمندی کو بھی ظاہر کرتی تھیں اور اردو زبان کے حوالے سے غلط فہمیاں پھیلانے والوں کے لیے ایک انتباہ کی حیثیت بھی رکھتی تھیں۔ انھوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ اردو جسے ہمارے ملک کے 80 کروڑ افراد بولتے ہیں، اس کے خلاف تعصب رکھنے والے لوگ اس ملک کی سیکولر تہذیب کے دشمن ہیں۔ انھوں نے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ حکومتِ ہند اردو کے فروغ کے تئیں سنجیدہ ہے اور اس کی ترویج وترقی کے لیے جو بھی مناسب اور ممکن اقدامات ہوں گے وہ کیے جائیں گے۔

جناب کپل سبل نے اپنی افتتاحی تقریر میں مزید کہا کہ مولانا آزاد نے آزاد ہندوستان کے لیے تعلیمی ترقی کا جو خاکہ تیار کیا تھا، اگر اس پر ابتدا ہی میں پوری توجہ صرف کی گئی ہوتی اور اسے کامل سنجیدگی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا گیا ہوتا تو تعلیم وتدریس کے شعبے میں جو مشکلیں اب ہمیں درپیش ہیں، وہ شاید سامنے نہ آتیں۔ مولانا آزاد نے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کے طور پر بچوں کو مفت تعلیم فراہم کرانے کا جو خواب دیکھا تھا، وہ اب 2009 میں پورا ہوا ہے، اگر ایسا شروع ہی میں ہوجاتا تو آج ہم تعلیمی میدان میں بہت آگے ہوتے اور اسی نسبت سے ملک نے تعمیر وترقی کی بہت سی منزلیں سر کرلی ہوتیں۔ جناب کپل سبل نے مولانا آزاد کی وطن پرستی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک سچے ہندوستانی تھے اور انھوں نے رنگ ونسل اور مذہب وملت کے اختلافات سے اوپر اٹھ کر اہلِ وطن کے درمیان باہمی اخوت اور رواداری کا جذبہ پیدا کرنے اور اسے فروغ دینے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ ایک موقع پر انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کو ملک کی آزادی پر بھی ترجیح دی تھی اور کہا تھا کہ میں ملک کی آزادی کے مطالبے سے دستبردار ہوسکتا ہوں اگر اس کی بنیاد ہندو مسلم نفاق پر رکھی جائے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قومی یک جہتی اور مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان باہمی رواداری کی مولانا آزاد کی نظر میں کتنی اہمیت تھی۔

جناب کپل سبل نے کہا کہ مولانا آزاد بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دینے کے حق میں تھے کیونکہ سبھی ماہرین تعلیم کا یہی کہنا ہے کہ بچوں کے نوخیز ذہنوں کی فطری نشوونما کے لیے یہ ضروری ہے لیکن آگے کی تعلیم میں وہ انگریزی کی اہمیت کے قائل تھے جو اب ایک بین الاقوامی زبان ہے اور عصری علوم کا سارا ذخیرہ اسی میں ہے۔ ان کے اس اندازِ فکر ہی کی ہم سب کو پیروی کرنی چاہیے۔ جناب کپل سبل کے علاوہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے جناب غلام نبی آزاد اور جناب سلمان خورشید نے بھی خطاب کیا۔ جناب غلام نبی آزاد نے کہا کہ مولانا ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک دوراندیش سیاستداں، مستند ماہر اسلامیات، بالغ نظر مفکر، معتبر صحافی اور بہترین مقرر تھے۔ انھوں نے ملک کی جدوجہد آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے اپنی ان سبھی حیثیتوں سے کام لیا۔ جناب سلمان خورشید نے اس موقع پر کہا کہ حکومتِ ہند اردو کی ترقی اور ترویج اور قومی یک جہتی کے استحکام کے تئیں پابند عہد ہے اور اس سمت میں مناسب اقدامات بھی کیے جارہے ہیں لیکن اردو زبان وادب کی بقا کے لیے صرف حکومت پر تکیہ کرلینا کافی نہیں، اردو والوں کو خود بھی اپنی ذمے داریاں نبھانی ہوں گی۔

●

اردو بول چال کی زبان کے طور پر آج بھی پورے ہندوستان کی زبان ہے بلکہ ہندوستان سے باہر بھی جہاں جہاں ہندوستانی یا پاکستانی جابسے ہیں اس کا رواج عام ہوگیا ہے لیکن یہ رواج اس کی دائمی بقا کی ضمانت نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے ابتدائی سطح سے اعلیٰ سطح تک اس کی تعلیم کا نظم ضروری ہے جیسا کہ محترم وزرا کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے موجودہ سرکار اردو کی بقا اور اس کی ترویج وترقی کے لیے سنجیدگی سے کچھ کرنے کی خواہاں ہے۔ حکومت کے اس رویے نے اردو والوں کے دلوں میں جو امیدیں جگائی ہیں، وہ بیجا نہیں ہیں مگر اپنی زبان کے تئیں خود ہماری جو ذمے داریاں ہیں انھیں بھی سمجھنے اور پورا کرنے کی ضرورت ہے۔

یعقوب یاور

سید احمد خاں اور بنارس

سرسید احمد خاں کی تاریخ ساز شخصیت پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ان کے قیام بنارس اور اس سے متعلق امور پر کم گفتگو ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنی اسّی سالہ زندگی کا ایک قابل لحاظ حصہ اور اپنی ملازمت کا سب سے زیادہ وقت اسی شہر میں گزارا تھا اور اپنے مزاج کے عین مطابق یہاں رہ کر بھی انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے کئی بنیادی کام انجام دیے تھے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور یگانگت بنائے رکھنے کی ان کی کوششوں کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ نتیجتاً وہ کافی بدظن اور مایوس ہو گئے تھے۔ ان کی دور بیں نگاہوں نے یہاں تک دیکھ لیا تھا کہ آئندہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس میں مل جل کر ایک ساتھ رہنا آسان نہیں ہوگا۔ مایوسی کے اس دور نے ان کے مزاج اور خیالات میں کچھ تبدیلیاں ضرور پیدا کر دی تھیں، لیکن نہ تو انھوں نے ان دونوں کے درمیان اتحاد برقرار رکھنے کی اپنی کوششوں کو روکا اور نہ ان کی فلاح کے لیے کیے جانے والے کاموں سے دست بردار ہوئے۔

عدالت خفیہ (اسمال کاز کورٹ) کے جج کے عہدے پر ترقی دیتے ہوئے انھیں 15 اگست 1867 کو علی گڑھ سے بنارس بھیج دیا گیا تھا اور یکم اپریل 1869 کو وہ یہیں سے انگلینڈ کے دورے پر چلے گئے تھے۔ اس طرح بنارس میں ان کے قیام کی یہ مدت تقریباً دو سال ہوتی ہے۔ انگلینڈ میں ایک سال پانچ ماہ قیام کے بعد وہ 4 ستمبر 1870 کو ہندوستان کے لیے روانہ ہو کر 2 اکتوبر 1870 کو بمبئی پہنچے۔ وہاں سے اسی مہینے بنارس واپس آنے کے بعد 31 جولائی 1876 کو اپنی ملازمت سے سبک دوشی تک وہ تقریباً چھ برس یہیں رہے۔ اس طرح ان کے بنارس میں دوسرے دور کے قیام کی مدت چھ برس اور بنارس میں ان کے قیام کی کل مدت آٹھ برس ہوتی ہے۔ بنارس آنے سے پہلے وہ 1862 سے 1864 تک تقریباً دو سال غازی پور میں بھی رہ چکے تھے، جو اس وقت بنارس کا ہی ایک حصہ تھا۔ غازی پور میں تقرری کے زمانے کو بھی اگر شمار کر لیا جائے تو ان کے قیام بنارس کی مدت کم و بیش دس سال ہو جاتی ہے، جو ان کی زندگی کا ایک قابل لحاظ حصہ ٹھہرتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو انھوں نے اپنی ملازمت کا سب سے زیادہ وقت بنارس اور اطراف بنارس میں صرف کیا تھا۔ اس زمانے کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کا مستقبل کی منصوبہ سازی کا بیشتر عمل اسی سرزمین پر رہ کر پورا ہوا تھا۔

1862 میں جب سرسید احمد خاں غازی پور آئے تھے تو وہ اپنی عمر کے 45 برس گزار چکے تھے اور ان کی ملازمت کی مدت 21 برس ہو چکی تھی۔ ملازمت کے اس دور ایے میں وہ عارضی سررشتہ دار سے ترقی کرتے کرتے صدر الصدور کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ اس دوران ان کا تبادلہ مختلف مقامات پر ہوتا رہا جس کی تفصیل اس طرح ہے:

(سررشتہ دار، 1838)، آگرہ (نائب منشی، 1839)، مین پوری (منصف، 1841)، فتح پور سیکری (منصف، 1842)، دہلی (منصف، 1846)، روہتک (قائم مقام صدر امین، 1850)، بجنور (صدر امین، 1855)، مراد آباد (صدر الصدور، 1858)۔ انھیں مغل دربار سے جواد الدولہ کا اپنا خاندانی خطاب عارف جنگ کے اضافے کے ساتھ مل چکا تھا اور وہ کئی کتب و رسائل تصنیف کر چکے تھے۔ جن میں مذہبی اور اصلاحی کتب کے علاوہ آئین اکبری کی تصحیح و اشاعت اور آثار الصنادید جیسی اہم کتابیں شامل تھیں۔

سید احمد کے قیام بجنور کے دوران ہی 1857 میں ہندوستانیوں نے ملک کے مختلف حصوں میں بغاوت کر کے انگریزوں سے اقتدار چھیننے کی آخری کوشش کی تھی جو انجام کار ناکام ثابت ہوئی تھی۔ یہ فیصلہ کن معرکہ اپنی ابتدا میں ہندوستان میں مقیم انگریزوں کے لیے پیغام اجل بن کر آیا تھا اور متعدد انگریز افسران اور ان کے افراد خاندان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے۔ لیکن انگریزوں کے خلاف اس غیر منظم بغاوت کی ناکامی کے بعد انگریزوں کے انسانیت سوز مظالم کا سلسلہ شروع ہوا اور ہزاروں بے گناہ ہندوستانیوں کو محض شک اور انگریزوں کی ہوس انتقام کی وجہ سے اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ اس معرکے میں سید احمد خاں نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے کئی انگریز خاندانوں کی جان بچائی، جس کی وجہ سے انگریزوں کے دلوں میں سرسید احمد خاں کے اعتبار اور وقار میں اضافہ ہوا تھا۔

سید احمد خاں 2 مئی، 1862 کو تبادلے پر مراد آباد سے غازی پور پہنچے تھے اور 1864 میں وہ علی گڑھ چلے گئے۔ دو برس کی اس مختصر مدت میں انھوں نے کچھ ایسے بنیادی کام انجام دیے جو آگے چل کر برگ و بار لائے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے 'تبئین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملت الاسلام' لکھنے کا آغاز کیا، جو توریت اور انجیل کی تفسیر و تفہیم پر مبنی کتاب تھی۔

سرسید سے پہلے عام طور پر دوسرے عقائد کی مقدس کتابوں کو اعتراض کرنے کے لیے پڑھنے کی روایت تھی۔ انھوں نے یہ تفسیر لکھ کر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دراصل تمام مذاہب کی روح ایک ہے، اس لیے ہمیں ان کا مطالعہ بھی ہمدردی سے کرنا چاہیے۔ حالانکہ اس کتاب کا تعلق مذہب سے ہے لیکن اس کتاب کی علمی اہمیت کم نہیں ہے۔ مثلاً سید احمد نے اس کتاب میں ہجری و عیسوی سنین کی مطابقت پر بحث کی ہے، جو آگے چل کر اس موضوع پر کام کرنے والوں کی مددگار ثابت ہوئی۔ انھوں میں بائبل میں مذکور مقامات اور اشخاص پر جغرافیہ اور تاریخ کی رو سے متعلقہ تفصیلات پیش کرنے کی سعی بھی کی، جو ان کی مشکل پسندی کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں بیٹھ کر ایسا کام کرنا آسان نہیں تھا۔ حالانکہ اس کتاب کو بنیاد بنا کر بعد میں ان پر مسلمانوں کی جانب سے مختلف الزامات عاید کیے گئے، اسے ان کی انگریز پرستی اور اسلام دشمنی کے ایک اور ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا، لیکن اس بات کا اعتراف تقریباً تمام لوگوں نے کیا کہ سید احمد خاں کی اس کتاب نے ہندوستانیوں میں نئے علوم سے دلچسپی کی تخم ریزی کی۔

1863 میں غازی پور ہی میں انھوں نے 'سائنٹیفک سوسائٹی' کی داغ بیل ڈالی۔ دراصل ان کا یہ اقدام ان کی منصوبہ بند تعلیمی تحریک کا ایک اہم حصہ تھا، جس کے آگے چل کر بڑے دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ 1857 کے خوں آشام واقعات اور اس کے بعد ان سے متاثر ہونے والوں کی بدحالی اور بے چارگی دیکھ کر ان کو خیال ہوا کہ ہندوستانیوں کی فلاح ان کی تعلیم میں پوشیدہ ہے اور رفتہ رفتہ انھوں نے اپنے اس خیال کو ایک تحریک کی شکل دے دی۔ اس سوسائٹی کے قیام سے پہلے ہی انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے خطبات و تقاریر میں اس بات پر زور دینا شروع کر دیا تھا کہ ہندوستانیوں کے لیے تعلیم کا حصول کتنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ کہنا بھی نہیں بھولتے تھے کہ مختلف مغربی علوم کو اردو میں منتقل کیا جانا چاہیے تاکہ یہ عام ہندوستانیوں کی دست رس میں ہوں اور وہ بھی ان علوم سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہاں کے لوگوں کو مختلف علوم وفنون کی تعلیم ان کی مادری زبان میں مہیا کرا دی جائے تو نہ صرف ان کے لیے اس کا حصول آسان ہو جائے گا بلکہ اس کے اثرات بھی دیرپا ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کے زیر اہتمام انگریزی کی ایسی اہم اور معیاری کتابوں کے اردو ترجمے کا کام شروع کیا جو ہندوستانیوں کو جدید تعلیم کی جانب متوجہ کرنے میں معاون ہو سکتی تھیں۔ حالانکہ آگے چل کر ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی تھی اور انھیں لگنے لگا تھا کہ مقامی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانا ہندوستان میں تعلیمی ترقی کے لیے مفید ثابت نہ ہوگا اور اس کے بعد انھوں نے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر اصرار ترک کر دیا تھا۔

سرسید نے اس سوسائٹی کا سرپرست ڈیوک آف ارگل کو بنایا، جو اس وقت حکومت ہند کے سکریٹری آف اسٹیٹ تھے۔ ان کے علاوہ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر میکلوڈ اور شمال مغربی صوبوں کے لفٹیننٹ گورنر ڈریمنڈ اس کے نائب سرپرست تھے۔ خود سید احمد خاں کی حیثیت اس سوسائٹی میں سکریٹری کی تھی۔ 1866 میں اس کا ایک خبر نامہ بھی جاری ہوا۔ غازی پور اور بعد میں علی گڑھ میں اس سوسائٹی کے زیر اہتمام تقریباً چالیس انگریزی کتابوں کے اردو تراجم کیے گئے، جس میں تاریخ، ریاضی، سائنس اور سیاست جیسے مختلف علوم کی کتابیں شامل تھیں۔ اس کام کے لیے انھوں نے مولوی ذکاء اللہ، منشی گنگا پرشاد، مولوی فیض الحسن اور منشی دھرم نرائن رائے جیسے معتبر لوگوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ یہ سید احمد خاں کی حکمت عملی کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کے اس اقدام کو نہ صرف حکومت کا خاطر خواہ تعاون حاصل ہوا بلکہ عام طور پر بالغ نظر ہندوستانیوں نے بھی اسے سراہا اور اس کام کے لیے اپنا دست تعاون دراز کیا۔ سوسائٹی کے معاونین میں مہاراجا بنارس ایشوری نرائن سنگھ، والی بھوپال نواب سکندر جہاں بیگم، مہاراجا جودھ پور، مہاراجا کپورتھلہ، مہاراجا جے پور، نواب رام پور، مہاراجا الور، مہاراجا اندور اور نواب ٹونک جیسے لوگ شامل تھے۔

اپریل 1864 کو سید احمد کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہو گیا تو اس سوسائٹی کی جملہ سرگرمیاں بھی علی گڑھ منتقل ہو گئیں۔ لیکن وہاں سے ایک بار پھر تبادلہ ہونے پر جب وہ بنارس کے لیے روانہ ہوئے تو اس سوسائٹی کی نگرانی کا کام انھوں نے علی گڑھ ہی میں راجہ جے کشن داس کے سپرد کر دیا جو اس وقت وہاں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ سید احمد خاں کی غیر موجودگی میں انھوں نے اس کام کو بڑی تندہی سے انجام دیا۔ خود سید احمد بھی بنارس میں رہتے ہوئے مختلف طریقوں سے اس سوسائٹی کی اعانت کرتے رہتے تھے۔

غازی پور میں انھوں نے دو رسائل بھی تحریر کیے۔ ایک 'رسالہ' التماس بخدمت ساکنان ہند درباب ترقی تعلیم اہل ہند'، جس کا مقصد، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ہندوستانیوں کو تعلیم کی جانب متوجہ کرنا تھا اور دوسرا 'رسالہ احکام طعام اہل کتاب' تھا، جس میں سامی مذاہب میں، جنھیں اہل کتاب بھی کہا جاتا ہے، کھانے پینے کے آداب کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔

سید احمد خاں کسی ایک منزل پر ٹھہر کر مطمئن ہو جانے والے انسان نہیں تھے۔ ان کے اندر ہندوستانیوں کی پس ماندگی، جہالت اور بدحالی دور کرنے کا شدید جذبہ تھا۔ انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام کے دو ماہ بعد مقامی اُمرا و رؤسا کی خواہش پر غازی پور ہی میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس کی ابتدائی کارروائیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید احمد خاں کا ارادہ اسے ایک بڑے کالج کی شکل دینے کا تھا، جو بہ وجوہ پورا نہ ہو سکا۔ اس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے انھوں

نے مشترکہ طور پر راجا دیونرائن سنگھ اور مولانا محمد فصیح سے درخواست کی۔ اس سے ان کا مقصد صاف تھا کہ وہ تعلیم کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق نہیں چاہتے تھے۔ سنگ بنیاد رکھے جانے میں ہندو اور مسلم نمائندگی کے پیچھے سید احمد کا جو مقصد تھا، وہ پورا بھی ہوا۔ اس مدرسے کو بلا تفریق مذہب و ملت سب کا اعتماد حاصل ہوا۔ اس کی نگرانی اور اسے بہتر طور پر چلانے کے لیے مختلف کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ انھوں نے راجا دیونرائن سنگھ کو مدرسے کا سرپرست اور وزیٹر مقرر کیا۔ اس مدرسے میں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اگر سید احمد خاں کے غازی پور میں قیام کی مدت میں کچھ اور توسیع ہو جاتی تو عین ممکن تھا کہ یہ چھوٹا سا مدرسہ ایک بڑے کالج کی شکل اختیار کر لیتا۔ کچھ عرصے بعد یہ مدرسہ ترقی کر کے ہائی اسکول کی شکل ضرور اختیار کر گیا اور اسے وکٹوریہ ہائی اسکول کے نام سے شہرت ملی۔

15 اگست، 1867 کو ان کا تبادلہ ایک بار پھر علی گڑھ سے بنارس کے لیے کر دیا گیا۔ اب یہاں وہ عدالت خفیفہ کے جج تھے۔ ان کے قیام بنارس کی مدت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی مدت 15 اگست 1867 سے 31 مارچ، 1869 تک یعنی تقرری سے بلاد برطانیہ کی جانب روانہ ہونے تک اور دوسری مدت وہاں سے واپسی کے بعد اکتوبر 1870 سے 31 جولائی 1876 یعنی ملازمت سے سبک دوشی تک۔ قیام کی ان دونوں مدتوں میں ان کی نفسیات، خیالات اور مزاج میں خاصا فرق واقع ہوا لیکن ایک چیز جو تمام زندگی ان کے ساتھ لگی رہی، یہاں بھی ہمہ وقت ان کے ساتھ رہی اور وہ اس کے لیے کوشاں رہے کہ انگریزوں کی عمل داری میں ہندوستانی بالخصوص مسلمان عزت و عافیت کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں۔ چنانچہ وہ یہاں رہ کر ہمہ وقت ایسے کاموں میں مصروف رہے جن سے بعد میں ان کی فلاح کے راستے ہموار ہونے میں مدد ملی۔

اپنے قیام بنارس کے پہلے دور میں ملازمت کی ذمے داریاں سنبھال لینے کے بعد جب وہ اس شہر اور یہاں رہنے والے لوگوں کو سمجھنے اور معززین شہر سے تعلقات استوار کرنے میں مصروف تھے، ان کی عدالت میں آنے والے چند اولین مقدمات میں ایک مقدمہ بھارتیندو ہریش چندر رسا بنارسی کا پیش ہوا، جن پر مدعی کی جانب سے عدم ادائیگی کے سبب چند ہزار کی نالش کی گئی تھی۔ سید احمد خاں کو جب ان کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف شہر کے متمول جاگیردار ہیں اور معززین شہر میں شمار کیے جاتے ہیں بلکہ اردو اور کھڑی بولی کے شاعر بھی ہیں تو انھیں ان سے فطری طور پر ہمدردی پیدا ہو گئی۔ انھیں خیال آیا کہ ایسا شخص کہاں عدالتوں کے چکر کاٹتا رہے گا، اس لیے انھوں نے فریقین سے عدالت کے باہر گفتگو کی اور دونوں میں مصالحت کرادی۔ آج جدید ہندی شاعری کے مرد اول کی حیثیت سے بھارتیندو ہریش چندر کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے اور ان کا شمار ہندی زبان کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے لیکن اس وقت وہ اردو کے ایک اوسط درجے کے شاعر تھے۔ بھارتیندو ہریش چندر آگے چل کر اردو دشمنوں کے میر کارواں بنے اور کبھی اس بات پر فخر کرنے والا یہ شاعر کہ اردو میری اور میرے تمام افراد خاندان کی مادری زبان ہے، اچانک دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی کی حمایت کرتے ہوئے یہ تک کہہ گزرا کہ اردو طوائفوں اور ان کے دلالوں کی زبان ہے۔ ان کا اور ان کے کچھ معاصرین کا یہی رویہ آگے چل کر اپنے انگلینڈ کے سفر سے واپس آنے کے بعد سید احمد کو ہندوؤں سے بدظن کرنے اور ہندو مسلم اتحاد کی جانب سے مایوس ہو جانے کا سبب بنا۔

قیام بنارس کے اس دور میں سید احمد خاں کی یکم اگست 1867 کی اس درخواست کو حکومت کی منظوری حاصل ہوئی، جو انھوں نے علی گڑھ میں رہتے ہوئے برٹش انڈین ایسوسی ایشن، اضلاع شمال مغرب کی جانب سے وائسرائے اور گورنر جنرل کی خدمت میں بھیجی تھی، جس میں ہندوستان میں ایک ورنا کیولر یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اعلیٰ درجے کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم وفنون کی تعلیم مقامی زبان میں ہوا کرے۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ مقامی زبان میں انھیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن میں انگریزی ذریعۂ تعلیم سے پڑھنے والے طالب علم کلکتہ یونیورسٹی میں امتحان دیتے ہیں۔ اور یہ کہ جو سندیں انگریزی پڑھنے والے طالب علموں کو دی جاتی ہیں وہی ان طلبہ کو بھی دی جایا کریں۔ سید احمد کی تجویز یہ تھی کہ یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کی ایک علاحدہ فیکلٹی قائم کر دی جائے یا پھر شمال مغربی اضلاع میں اس نوعیت کی ایک جداگانہ یونیورسٹی قائم ہو۔ اپنی اس درخواست میں انھوں نے حکومت کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس یونیورسٹی کی ضروریات کی تکمیل کے لیے جہاں تک ممکن ہوگا، مختلف علوم کی انگریزی کتب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام سائنٹفک سوسائٹی کے زیر اہتمام خود کریں گے۔ ان کی اس درخواست پر حکومت نے سنجیدگی سے غور کیا اور انھیں 5 ستمبر، 1867 کو اس کی منظوری کا مراسلہ بنارس میں موصول ہو گیا۔ اس منظوری کے ساتھ ہی سائنٹفک سوسائٹی میں بڑے پیمانے پر ترجمے کے کام کا آغاز ہوا۔ اس کے لیے حکومت سے مالی اعانت کی درخواست کی گئی جسے منظور کر لیا گیا، لیکن بعد میں مختلف وجوہ کی بنا پر سید احمد خاں کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

قیام بنارس کے اس دور میں ان کا ایک اور کارنامہ وہاں ہومیو پیتھک شفا خانے کا قیام تھا۔ سید احمد خاں کو معلوم ہوا کہ ہومیو پیتھی طریقۂ علاج سے بہتر،

مفید، ارزاں اور بے خطر کوئی دوسرا طریقۂ علاج نہیں ہے اور یہ ہندوستان کے غریب عوام کے مزاج کے عین مطابق بھی ہے۔ چونکہ یہ بات اب ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی کہ وہ جس کام کو قوم کے لیے مفید سمجھتے تھے اس کو انجام دینے کے لیے جی جان سے لگ جاتے تھے، اس لیے اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں بھی مصروف ہو گئے۔ انھوں نے ایک کمیٹی قائم کی، جس کا مقصد ہندوستان میں ہومیوپیتھی طریقۂ علاج کی ترویج اور ہندوستانیوں کو اس جانب مائل کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے صدر مہاراجا بنارس تھے اور سکریٹری کی ذمے داری خود سید احمد خاں نے سنبھالی۔ اس کمیٹی کی تجویز پر بنارس میں 25 ستمبر، 1867 کو ایک شفاخانہ کھولا گیا جس کا نام 'ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل' رکھا گیا۔ اس ہاسپٹل کی ذمے داری صدر کی حیثیت سے سائڈ جج ج. ایچ. آئرن کے سپرد کی گئی، سید احمد خاں نے اپنے کئی دوستوں کو بھی، جو کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا تھے، اس طریقۂ علاج کی جانب متوجہ کیا اور بنارس بلا کر ان کا علاج کروایا۔ انھوں نے اسے عوام میں رواج دینے کے لیے جگہ جگہ لکچر دیے اور ایک کتابچہ بھی تحریر کیا جس میں ہومیوپیتھی سے ہیضے کا علاج بتایا گیا تھا۔

حالانکہ قیام بنارس کے اس دور میں انھیں بہت کم وقت ملا اور اس میں سے بھی خاصا وقت سید محمود کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفہ ملنے کے بعد ان کے ساتھ انگلینڈ جانے کی تیاریوں کی نذر ہوگیا۔ وہ بنارس ہی سے انگلینڈ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ سید خداداد بیگ، ان کے دونوں صاحبزادے سید حامد اور سید محمود اور ان کا ذاتی ملازم چھجو شامل تھے۔ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ سر ولیم میور کی کتاب 'حیات محمدؐ' کا جواب لکھنے کے لیے انگلینڈ کے کتب خانوں سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ وہاں کی تعلیم گاہوں کی کارکردگی کا مطالعہ کرکے اسی طرز پر ہندوستان میں بھی تعلیم کی فراہمی کا ایک جامع اور مفید لائحۂ عمل ترتیب دینا چاہتے تھے۔ اس سفر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے انھوں نے اپنی ذاتی لائبریری فروخت کر دی۔ جب اس سے بھی اخراجات پورے ہونے کی سبیل نہ پیدا ہوئی تو انھوں نے اپنا گھر اور جائیداد گروی رکھ کر کچھ قرض حاصل کیا اور یکم اپریل 1869 کو انگلینڈ کے لیے رخت سفر باندھا۔

سید احمد خاں کے انگلینڈ روانہ ہو جانے کے بعد بنارس میں ایسا بہت کچھ ہوا جو انھیں کسی صورت پسند نہیں آ سکتا تھا۔ یہاں کے چند سر کردہ رئیسوں نے اردو کے خلاف ایک محاذ کھول دیا تھا اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ایک نئی زبان 'ہندی' کی ترویج کے لیے کوشاں تھے۔ نئی زبان رائج کرنا کوئی برا کام نہیں تھا لیکن اس کے لیے انھوں نے مذہب کی بنیاد پر ہندوؤں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندوؤں کو اسے استعمال نہیں کرنا چاہیے، جس سے دونوں فرقوں کے درمیان خیر سگالی کا ماحول خراب ہونے لگا۔

سید احمد خاں کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہیں۔ اردو کو وہ ایک ایسی مشترکہ زبان کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر رائج تھی۔ اس وقت اردو بلا تفریق مذہب و ملت تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان تھی۔ جو علاقے دوسری زبانوں کے تھے وہاں بھی اردو رابطے کی زبان کا کام کر رہی تھی۔ جب بنارس میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر اردو کی مخالفت اور ہندی کو رواج میں لانے کی تحریک شروع ہوئی تو یہاں سید احمد خاں کو ایک فرقہ پرست مسلمان کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ ان لوگوں میں راجا شیو پرساد اور بھارتیندو ہریش چندر بھی شامل تھے۔ یہ الزام ان پر صرف اس لیے لگایا جا رہا تھا کہ وہ اردو کے حامی تھے۔ انگلینڈ میں جب انھیں اس تحریک کی اطلاع ملی تو انھوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے محسن الملک کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

> ''ایک اور مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھے کمال رنج و فکر ہے کہ بابو شیو پرساد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو، خط فارسی کو، جو مسلمانوں کی نشانی ہے، مٹا دیا جائے۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے۔ اور اگر ہندو مستعد ہوئے، اور ہندی پر اصرار کیا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علاحدہ مسلمان علاحدہ ہو جاویں گے۔''
>
> [سر سید احمد خاں، مکتوب سر سید مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، جلد اول، صفحہ 463، 464]

افتخار عالم خاں نے اپنے ایک مضمون میں اس صورت حال کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں سر سید نے بابو شیو پرساد کی عرض داشت پر کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن بابو شیو پرساد نے (جو سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر بھی تھے) سائنٹفک سوسائٹی کے ہندو ممبران کی ایک میٹنگ کی۔ اس میں مطالبہ کیا کہ کتابوں کے ترجمے ورنا کیولر (یعنی اردو) کے ساتھ ساتھ ہندی میں کروائے جائیں اور سائنٹفک سوسائٹی کا اخبار اردو اور انگریزی کے بجائے اردو اور ہندی میں نکالا جائے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی ایک

مکمل سیکولر ادارہ تھا جس میں پہلی بار بابو شیو پرساد کے ذریعے فرقہ وارانہ بیج بوئے گئے تھے۔ سرسید اس وقت انگلینڈ میں تھے۔ راجہ جے کشن داس صاحب سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری کے بطور کام کر رہے تھے۔ لسانیاتی تنازعے نے جب سائنٹفک سوسائٹی کے دروازے پر فرقہ وارانہ انداز میں دستک دینا شروع کر دی تھی اس وقت سرسید خاصے مایوس اور بددل ہوئے تھے۔''

[کانفرنس گزٹ، ایڈیٹر پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی، مئی 2008، پروفیسر افتخار عالم خاں، صفحہ 24]

بعد میں پتہ چلا کہ اصل حقیقت یہ تھی کہ شیو پرساد نے صرف اس بات کی حمایت کی تھی کہ جو زبان رائج ہے اسے دیوناگری رسم الخط میں بھی تحریر کیا جائے اور اس رسم الخط کو عدالتوں میں بھی رائج کیا جائے۔ ان کے پیش نظر صرف یہ بات تھی کہ کئی زبانوں کا رسم الخط چونکہ دیوناگری سے قریب تھا اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس رسم الخط کو استعمال کرتی ہے اس لیے اردو جیسی مقبول عام زبان کو اس رسم الخط میں بھی لکھا جانا چاہیے۔ لیکن اردو دشمنوں نے ان کی اس بات کو اپنی حمایت سمجھا اور لے اڑے۔

خود شیو پرساد گپت، ستارۂ ہند کا وہ بیان بھی اس بات کو سمجھنے میں معاونت کرتا ہے جو انھوں نے 1880 میں اپنے ریٹائرمنٹ کے وقت جاری کیا تھا۔ لکھتے ہیں:

''میں نے 1868 میں عدالتوں میں رائج رسم الخط کے سلسلے میں ایک یادداشت دائر کی تھی۔ میرا مقصد صرف رسم الخط کے سلسلے میں آواز اٹھانا تھا اور مجھے اس میں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی لیکن اب مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ 'مجھے میرے حمائیتیوں اور ہمدردوں سے بچاؤ' میرے ہم خیال ہم وطنوں یعنی بے وقوف ہندوؤں نے اس کو ہندی اردو کا سوال بنا دیا ہے اور اسکرپٹ کا مسئلہ پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ انھوں نے ان تمام فارسی الفاظ کے خلاف جہاد شروع کر دیا ہے جو ہمارے گھروں میں ہمارے بچے اور ہماری عورتیں بولتی ہیں، جو ہمارے شہروں اور گاؤں میں یکساں طور پر رائج ہیں۔''

شیو پرساد گپت سے سید احمد خاں کے دوستانہ روابط تھے۔ حالانکہ وہ دیوناگری کی حمایت میں ان کے بیان کو ہندو مسلم منافرت کی تخم ریزی سمجھ رہے تھے لیکن مجموعی طور پر ان سے بدگمان نہیں تھے۔ جب ان کے بیان پر محسن الملک نے شیو پرساد گپت کے خلاف مضمون لکھ کر سائنٹفک سوسائٹی کے ترجمان میں چھپنے کے لیے راجہ جے کشن داس کو بھیجا اور انھوں نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا تو انھوں نے اس کی شکایت خط لکھ کر سید احمد خاں سے کی۔ سید احمد خاں نے جواب میں جو خط ان کو لکھا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''مگر تعجب ہے کہ آپ کو بابو شیو پرساد صاحب کے مسلمانوں کی نسبت چند کلمات جو کچھ زیادہ سخت نہ تھے، لکھنے ایسے برے معلوم ہوئے، مگر جو ان کی یعنی مسلمانوں کی نیک نامی، یعنی بدنامی، خوبی، یعنی بدی، ہر روز تمام ہندوستان کے اخباروں میں چھپتی رہتی ہے اور کوئی نالائقی اور پاجی پن کی حرکت ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں کی نسبت نہ لکھی جاتی ہو اور غیر مسلم مسافروں نے جو اپنے سفرناموں میں مسلمانوں کی نالائقیوں کا حال لکھا ہے اس سے آپ کو کوئی رنج نہیں ہوا۔ صرف اس کا سبب یہ ہے کہ ان حالات سے آپ کو اطلاع نہیں ہوئی۔ میری رائے میں آپ بابو شیو پرساد کا جواب، جس کے چھاپنے سے راجہ جے کشن داس بہادر نے انکار کیا، کسی اخبار میں مت چھپوایئے۔''

بنارس واپس آنے اور اپنے عہدے کا چارج لینے کے بعد سید احمد خاں اپنے سفر کے تجربوں کی روشنی میں مسلمانوں کو تعلیم کی جانب متوجہ کرنے اور انھیں اعلیٰ تعلیم کے تمام وسائل فراہم کرانے کے اپنے خوابوں کو تعبیر سے ہم کنار کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ ان کی تعلیمی تحریک میں دو بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ مسلمان عام طور پر انگریزوں اور انگریزی تعلیم سے نفرت کرتے تھے اور دوسرے ان کی مذہبی اوہام پرستی آئے دن نئے گل کھلاتی رہتی تھی۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر انھوں نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، جس کا ارادہ انھوں نے انگلینڈ ہی میں کر لیا تھا۔ اس رسالے کے لیے کافی کچھ تیاری وہ لندن ہی سے کر کے چلے تھے۔ اس کا پہلا شمارہ بروز عید الفطر 1287 ہجری مطابق 24 دسمبر، 1870 کو نکلا اور ان کے بنارس کی تمام مدت قیام تک تقریباً چھ برس تک مسلسل نکلتا رہا۔ ابھی اس کے دو تین شمارے ہی منظر عام پر آئے کہ چاروں طرف سے اس کی مخالفت کا شور اٹھنا شروع ہو گیا۔ اس کے رد میں کچھ دوسرے رسائل جاری ہوئے۔ اس کے ایڈیٹر چونکہ خود سید احمد خاں ہی تھے اس لیے جگہ جگہ سے ان کے حق میں کفر کے فتوے جاری ہونے لگے۔ لیکن سید احمد خاں کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی اور یہ رسالہ مسلسل نکلتا رہا۔ اس میں ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جنھیں پڑھ کر مسلمانوں میں علوم جدیدہ سے رغبت پیدا ہو اور وہ مذہب کے نام پر اوہام پرستی میں مبتلا نہ

ہوں۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں یہ رسالہ مقبول ہونے لگا۔ اس رسالے میں بیشتر سید احمد خاں اور مہدی علی خاں کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں، جو لوگوں کو پسند آتی تھیں۔ کچھ لوگ اس رسالے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ جب سرسید نے اسے بند کر دیا تو اسے جاری رکھنے کے لیے انھیں لوگوں کے بے شمار خطوط موصول ہوئے اور نتیجے میں انھیں اسے علی گڑھ سے دوبارہ شائع کرنا پڑا۔

سید احمد خاں نے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کرنے کے ساتھ ساتھ عوام اور کچھ والیان ریاست کے چندے سے مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے 26 دسمبر، 1870 کو بنارس میں ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' کے نام سے ایک کمیٹی قائم کی۔ اس کے سکریٹری خود سید احمد خاں تھے۔ اس کے لیے وہ اردو اور انگریزی میں لندن ہی سے اشتہارات چھپوا کر مولوی سید مہدی علی خاں کے پاس جو اس وقت مرزا پور کے تحصیل دار تھے، بھجوا چکے تھے۔ اس اشتہار کا عنوان 'التماس بخدمت اہل اسلام و حکام ہند درباب ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان '' تھا۔ انھوں نے بنارس میں اس کمیٹی کے زیر اہتمام ایک جلسے کا انعقاد کیا جس میں شرکت کے لیے انھوں نے محسن الملک کو ایک دن قبل علی گڑھ سے بنارس بلایا۔ دیر رات تک دونوں مسلمانوں کی فلاح سے متعلق مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ اس جلسے میں لوگوں کے لکھے ہوئے مضامین پر انعامات کا اعلان بھی ہونے والا تھا۔ دوسرے دن جب نتائج سامنے آئے تو سید اشرف علی ایم۔ اے کو، جو اس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے، پہلا انعام ملا۔ دوسرا انعام مولوی مشتاق حسین کو، مولوی عبد الودود تیسرے انعام کے مستحق قرار پائے۔ تمام موصولہ مضامین کی روشنی میں، جو تعداد میں بتیس تھے، ایک رپورٹ تیار کی گئی جس میں مندرجۂ ذیل باتیں تھیں۔

(الف) ہندوستان کے بالغ نظر مسلمان انگریزی تعلیم کی مخالفت کرنے والے مسلمانوں کو گمراہ سمجھتے ہیں اور ان کے اس عمل کو مسلمانوں کے مستقبل کے لیے مہلک گردانتے ہیں۔

(ب) سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی تعداد ہندو طالب علموں کے مقابلے میں جتنی ہونی چاہیے اس سے بہت کم ہے۔

(ج) جن بنیادوں پر مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری مدارس میں نہیں بھیجتے ان میں سے کچھ واجب ہیں تو کچھ ناواجب بھی ہیں۔

(د) سرکاری طریقۂ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہے اور اگر سرکار مسلمانوں کے لیے اپنے طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی کر بھی دے تو بھی ان کی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہو سکتیں۔

(ہ) مسلمانوں کے لیے اپنے قدیم علوم کے تحفظ اور جدید علوم کے حصول کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کا معقول انتظام کریں۔

اسی رپورٹ میں سید احمد خاں نے مسلمانوں کے طریقۂ تعلیم سے متعلق ایک عملی منصوبہ اور ایک کالج کی تجویز بھی پیش کی۔ یہ رپورٹ عوام میں مشتہر کرنے کے علاوہ حکومت ہند اور تمام مقامی حکومتوں کو بھی بھیجی گئی۔ مدراس، بنگال اور بمبئی کی مقامی حکومتوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں جو تدبیریں اختیار کی تھیں، ان کے تمام کاغذات سکریٹری کے پاس بھیج دیے گئے۔ بالآخر 9 اگست، 1872 کو سید احمد خاں کو اس نئے کالج کے منصوبے کو حکومت ہند کی منظوری ملی، جس خط کے ذریعے یہ منظوری ملی اس میں لکھا تھا کہ گورنر جنرل نے اس رپورٹ پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ انھیں ایسے کالج کے قیام سے نہایت خوشی ہوگی اور اگر کمیٹی اس سمت میں اقدام کرتی ہے تو حکومت اس کی مدد بھی کرے گی۔

اس کے بعد سید احمد خاں نے' کمیٹی خزنتہ البضاعتہ لتاسیس مدرستہ المسلمین ' کے نام سے ایک اور کمیٹی تشکیل دی تاکہ اس کالج کے قیام کے لیے چندہ وصول کرنے کی مہم کا آغاز کیا جا سکے۔ سید احمد خاں اس کے تاحیات سکریٹری مقرر ہوئے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ جب تک کالج کے قائم کرنے لائق چندہ جمع نہ ہو جائے اس وقت تک اس کمیٹی کا صدر مقام وہی رہے جہاں سکریٹری کا قیام ہو۔ چنانچہ جب تک علی گڑھ میں اس کالج کا قیام عمل میں نہ آ گیا، اس کمیٹی کا دفتر بنارس ہی میں رہا، جہاں اپنی ملازمت کی وجہ سے سید احمد خاں کا قیام تھا۔ آگے چل کر ایک اشتہار کے ذریعے لوگوں کی رائے دریافت کی گئی کہ اس کالج کو کس شہر میں قائم کیا جائے۔ رائے دینے والوں میں سے اکثریت نے علی گڑھ کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان میں سے بیشتر کو یہ بات معلوم تھی کہ سید احمد خاں اپنی ملازمت سے سبک دوش ہو کر جلد ہی علی گڑھ میں مستقل قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سید احمد کی اس مہم کو مزید تقویت اس وقت حاصل ہوئی جب وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے وظائف کی مد میں اپنی جیب خاص سے مبلغ دس ہزار روپئے ارسال کیے۔ شمال مشرقی اضلاع کے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور اور الہ آباد ہائی کورٹ کے جج اسپنکی نے بھی عطیات کی شکل میں معقول رقوم سید احمد خاں کو ارسال کیں۔ اس سے انھیں اس منصوبے کو رفتار دینے کا حوصلہ ملا۔ اب سید احمد خاں نے اس کے لیے بڑے پیمانے پر چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ ردعمل کے طور پر ایک بار پھر جگہ جگہ سے ان کے خلاف فتوے جاری ہوئے اور مسلمانوں کے ایک حلقے نے سید احمد اور ان کے اس منصوبے کی شدید مخالفت کی۔ ان اعتراضات کا اثر یہ ہوا کہ ان کو ملنے والے چندوں میں

کمی آنے لگی۔ چنانچہ سید احمد خاں نے چندہ وصولی کی اس مہم کو تقویت دینے کے لیے از سرنو اقدامات کیے اور اپنے رفیقوں کے ساتھ اس کام میں لگ گئے۔ انھوں نے خود دور دراز کے علاقوں کے دورے کیے۔ رفتہ رفتہ انھیں کامیابی حاصل ہونے لگی اور مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کی فراہمی کے لیے کالج کھولنے کا یہ خواب اپنی تعبیر سے قریب نظر آنے لگا۔

سید احمد خاں کے قیام بنارس کے دوران ان پر کچھ ہندوؤں کی جانب سے بھی فرقہ پرست اور جانب دار ہونے کا الزام لگایا گیا۔ ان کی مذہبی رواداری پر سوال اٹھائے گئے۔ ایسا پہلے بھی ہوا تھا۔ لیکن یہ لوگوں کی ناواقفیت یا پھر تعصب کی بنیاد پر تھا۔ ان کی غیر جانب داری اور مذہبی رواداری کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ انھوں نے بنارس میں رہتے ہوئے ایسے موقعے پر آریہ سماج کے بنیاد گزار سوامی دیانند سرسوتی کی جان بچانے اور انھیں تحفظ فراہم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا، جب بنارس کے پنڈت ان کی جان کے درپے تھے۔ در پردہ خود مہاراجا بنارس بھی ان پنڈتوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ دیانند سرسوتی اور آریہ سماج کی تحریک کو عام طور پر اسلام مخالف سمجھا جاتا ہے، سوامی جی نے اسلام اور قرآن کے خلاف کافی کچھ لکھا تھا۔ اس کے باوجود جب انھوں نے سید احمد خاں سے مدد طلب کی تو ان کو تحفظ فراہم کرانے اور ہندوؤں سے ان کی مصالحت کرانے کے لیے تیار ہو گئے اور اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے یہ مسئلہ حل کر دیا۔

اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی نے جب ویدوں کی بنیاد پر بت پرستی کی مخالفت شروع کی اور ویدوں کے علاوہ ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کے قابل اعتبار ہونے سے انکار کیا تو بنارس کے پنڈت ان کے اس حد تک مخالف ہو گئے کہ انھیں جان سے مار ڈالنے تک کی سازشیں کرنے لگے۔ انھیں زہر دے کر مارنے کی کوشش ہوئی، لیکن وہ خوش قسمتی سے بچ گئے۔ 1869 میں بنارس کے درگا کنڈ کے پاس واقع راجا امیٹھی کے آنند باغ میں دونوں فریقوں کے درمیان ایک مناظرہ ہوا (16 نومبر، 1869 بروز منگل)، جس میں ایک طرف دیانند سرسوتی تنہا تھے اور دوسری طرف بنارس کے علمائے ہنود، جن کی رہنمائی اپنے عہد کے جید عالم سوامی وشدھا نند کر رہے تھے۔ اس مناظرے کی صدارت مہاراجا بنارس، ایشوری نرائن سنگھ کر رہے تھے، جنھیں حَکَم کی حیثیت سے آخری فیصلہ بھی دینا تھا۔ اس مناظرے کے بعد دونوں فریق اپنی جیت اور مخالف کی ہار کے مدعی تھے۔ لیکن اس کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے علمائے ہنود اپنے عقاید کے تحفظ اور ہندو عوام کو اپنی قدیم روایات سے باندھے رکھنے کے لیے دیانند سرسوتی کی شکست کا اعلان کر کے کسی نہ کسی طرح ان کی علمیت کا اثر کم کرنا اور انھیں بدنام کرنا چاہتے تھے۔ اس میں مہاراجا بنارس بھی شامل تھے۔ سوامی جی کی کمزوری یہ تھی کہ وہ ہندی سے ناواقف تھے۔ مناظرے میں ساری گفتگو سنسکرت میں ہو رہی تھی جو عوام کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ گفتگو کے دوران ایک مرحلہ ایسا آیا جب اچانک سوامی جی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے تمام پنڈت اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ اعلان کرنے لگے کہ دیانند ہار گیا۔ جب کہ اصل میں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے جب دیانند نے پوچھا کہ ویدوں میں بت پرستی کی حمایت میں اگر کچھ ہو تو بتائیں تو اس کے جواب میں بنارسی پنڈتوں نے کہا کہ تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم ویدوں کے علاوہ دوسرے دھارمک گرنتھوں کو قابل اعتبار کیوں نہیں مانتے۔ کچھ دیر بعد بحث کو بنیادی موضوع سے ہٹانے کی غرض سے مناظرے کو سنسکرت قواعد کے گورکھ دھندوں میں الجھا دیا گیا۔

[مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے کاشی کی پانڈتیہ پرمپرا، آراچیہ پنڈت بلدیو اُپادھیاے، صفحہ 63 تا 64]

اس مناظرے میں ہار جانے کی شہرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیانند سرسوتی کو مقام مناظرہ سے اپنی جان بچا کر جانا مشکل ہو گیا، کیونکہ عوام اتنے مشتعل تھے یا انھیں اتنا مشتعل کر دیا گیا تھا کہ وہ ان کا خاتمہ کیے بغیر وہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ سید احمد خاں کو، جو دیانند سرسوتی کے پرانے شناسا تھے، جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے بنارس کے کمشنر اور اپنے دوست شیکسپیئر کے ساتھ مل کر، مہاراجا بنارس سے ان کی ملاقات کا اہتمام کرایا اور اس طرح فریقین کے درمیان صلح صفائی کی صورت نکلی۔ ایک روایت کے مطابق اس ملاقات میں مہاراجا نے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا اور سید احمد خاں اور شیکسپیئر کے کہنے پر سوامی جی کو بنارس میں شاہی مہمان کا درجہ دیا۔ لیکن پنڈتوں کے دل کا غبار صاف نہیں ہوا تھا، چنانچہ اس کے بعد بھی انھوں نے انھیں بنارس میں دو بار زہر دے کر مارنے کی ناکام کوشش کی اور آخر میں ان کی موت بھی زہر ہی سے واقع ہوئی لیکن یہ واقعہ بنارس کا نہیں اجمیر کا ہے۔

بنارس میں سید احمد خاں کی سرگرمیوں کا یہ ایک اجمالی خاکہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں رہ کر انھوں نے ہندوستانیوں اور امت مسلمہ کی بہبود کے لیے کئی کام انجام دیے۔ علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کا افتتاح ہو جانے کے بعد اسے تقویت دینے اور اپنی تعلیمی تحریک کو مزید استحکام دینے کی غرض سے انھوں نے اپنی ملازمت سے قبل از وقت سبک دوشی کی درخواست دی، جو منظور کر لی گئی اور اگست 1876 میں وہ مستقل قیام کی غرض سے علی گڑھ چلے گئے۔ □□□

پتہ:
Department of Urdu
Banaras Hindu University
Varanasi - 221005, (U. P.)

اطہر فاروقی

انگریزی نظامِ تعلیم میں اردو نصاب کا مسئلہ

یہ مضمون اسکولوں کے اردو نصاب کے ان مختلف زاویوں کا احاطہ کرتا ہے جو بالخصوص چھٹی جماعت سے بارھویں جماعت تک کے سیاق و سباق میں اہم ہیں ہندوستان کے اسکولوں کے نظام میں اردو کی تعلیم بالخصوص دو سطحوں پر دی جاتی ہے:

1. بہ حیثیت ذریعۂ تعلیم
2. ایک اختیاری مضمون کے طور پر

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اختیاری مضمون کے طور پر اردو زبان کی تعلیم بہ حیثیتِ زبانِ اول، دوم اور سوم دی جاتی ہے۔

اس سیاق و سباق میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان کے ان اسکولوں میں جہاں ذریعۂ تعلیم اردو نہیں ہے، وہاں عموماً اور انگریزی ذریعۂ تعلیم کے پبلک اور کونونٹ اسکولوں میں خصوصاً اردو تیسری زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ ایسا مگر نہیں ہے کہ کوئی طالب علم کسی بھی ایسے اسکول میں، جہاں اردو کے علاوہ کوئی اور ذریعۂ تعلیم رائج ہے، زبانِ سوئم کے طور پر اردو کا مطالعہ ایک اختیاری مضمون کے طور پر کر سکتا ہے۔ اردو تعلیم کا نظم اسکول انتظامیہ اور والدین کی خواہشات کے تابع ہوتا ہے۔

اسکول کی سطح پر نصاب کے سلسلے میں اردو اور دیگر زبانوں کے ذریعۂ تعلیم والے اسکولوں میں ایک اختیاری مضمون کے طور پر اردو کی تعلیم و تدریس کا جائزہ لینا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا اردو ذریعۂ تعلیم کا موضوع۔ انگریزی میڈیم کے اسکولوں میں اردو تعلیم کے نظم اور انگریزی میڈیم کے طلبہ کے لیے اردو پڑھنے کی مجموعی سہولیات کا جائزہ بھی اس سیاق و سباق میں کم اہم نہیں، اسی لیے لامحالہ انگریزی زبان کی تدریس کے لیے موجود مواد کا معیار اور دیگر متعلقہ زاویے زیرِ بحث آئیں گے۔ انگریزی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اردو ہی نہیں کسی بھی دوسری زبان کی تدریس کو اسی معیار پر رکھیں گے جو ان اسکولوں میں تعلیم کا عمومی معیار ہے۔ اگر اردو کی تدریس کا معیار وہ نہیں ہوگا جو ان اسکولوں میں پڑھائی جانے والی کسی بھی دوسری زبان کا ہے، تو طلبہ اردو کا مطالعہ نہیں کریں گے۔ اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ جویائے علم ہوتے ہیں، اردو سیاست کے شقاوت پسند شناور نہیں۔

بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اردو اور انگریزی کے تدریسی نظام کا موازنہ بے تکی بات ہے۔ یہ بات بالعموم وہ لوگ کہیں گے جنھوں نے کبھی اسکول کے نظام میں اردو کی تعلیم کے سوال پر سنجیدگی سے نہ سوچا ہو۔ اردو اور انگریزی کے تدریسی نظام کا موازنہ بالکل فطری اس لیے بھی ہے کیوں کہ ہندوستان اور بیرونی ممالک کے ان اسکولوں میں جن کا الحاق ہندوستان کے سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری بورڈوں سے ہے، وہاں اردو اور انگریزی دونوں ہی پہلی، دوسری اور تیسری زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے آئین کی رو سے اردو یہاں کی قومی زبانوں میں سے ایک ہے جب کہ انگریزی غیر ملکی زبان ہے۔

اگر ہم ہندوستان میں اردو زبان کے موجودہ نصاب کا جائزہ لیں تو بغیر کسی تکلف اور تامل کے اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ایسا تدریسی مواد تیار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے جو اردو زبان کی فہم اور اردو ادب کو سمجھنے میں زیرِ تعلیم جدید ذہنوں کی مدد کر سکے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج تک اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی ہے۔

ہندوستان میں ایسے کئی ادارے ہیں جو مختلف ریاستوں میں مختلف تعلیمی بورڈوں کے لیے نصابی کتابیں تیار کراتے اور چھاپتے ہیں۔ این.سی.ای.آر.ٹی. National Council of Educational Research and Training کے نام سے سبھی واقف ہیں جو دہلی اور ملک کے دیگر مقامات پر خاص طور سے سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن CBSE سے الحاق شدہ اسکولوں کے لیے کتابیں تیار کراتی ہے اور انھیں چھاپ کر رعایتی نرخ پر طلبہ کو فراہم بھی کراتی ہے۔ اردو کی حد تک NCERT اور ریاستی حکومتوں کے مختلف محکموں کی جانب سے اور بعض صوبوں کی ایس سی ای آر ٹیز (SCERTs) ہی کی تیار کردہ اردو کتابیں غیر معیاری ہوتی ہیں۔ اگر دوسری زبانوں کے اس تدریسی مواد سے جو این.سی.ای.آر.ٹی. اور ایس.سی.ای.آر.ٹیز جیسے ادارے شائع کرتے ہیں، اردو کی نصابی کتابوں کا موازنہ کیا جائے تو معیار میں زمین آسمان کا فرق پہلی نظر میں سامنے آجاتا ہے۔ یہ کتابیں طلبہ میں اردو زبان کی فہم اور اس کے ادب کے لیے دل چسپی پیدا کرنے میں قطعی ناکام ہیں۔ اردو کی کتابوں کا مواد ہی نہیں ان کی چھپائی وغیرہ بھی گھٹیا درجے کی ہوتی ہے۔ یہ کتابیں ان لوگوں کے ذریعے تیار کرائی جاتی ہیں جو اسکولی سطح پر کلاس روم میں پڑھانے کے طریقوں اور بچوں کی نفسیات سے قطعاً ناواقف ہیں، جنھوں نے Pedagogy کا لفظ بھی کبھی نہیں سنا اور اسکولی سطح پر تدریس کے معیار کا کوئی تصور جن کے ذہن میں نہیں۔

ان کتابوں کے لکھنے والے بالعموم اردو کے نام نہاد نقاد اور یونیورسٹی ٹیچر ہوتے ہیں (ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں اردو کا ٹیچر بن جانا ہی نقاد ہونے کا دعویدار ہونے کے لیے کافی ہے)۔ یہ حضرات نصاب کی کتابیں تیار کرنے کے کام کو محض کچھ اور پیسے کمانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ اسکولی سطح پر اردو پڑھانے کا کام کرتے ہیں ان میں سے اکثر اس پر کڑھتے رہتے ہیں کہ آخر وہ کیوں کسی یونیورسٹی میں اردو کے استاد کی نوکری پانے کا شرف حاصل کرنے سے رہ گئے۔ زبان کی تدریس جو کسی بھی استاد کا فرضِ اولین ہے اور زبان کی عمارت میں بنیاد کی اینٹ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کا احساس اب کالج اور یونیورسٹیوں کے استادوں میں ختم ہوئے نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔

ہندوستان میں اردو کا ناقص تدریسی مواد انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو پڑھنے کے خواہش مند طلبہ کو اردو کی بجائے غیر ملکی زبانوں مثلاً فرنچ یا جرمن سیکھنے کی طرف کہیں زیادہ راغب کرتا ہے۔ غیر ملکی زبانیں ہونے کے باوجود ایک اختیاری مضمون کے طور پر فرنچ اور جرمن جیسی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہندوستان میں بے شمار اعلا درجے کی کتابیں اور دیگر سہولیات موجود ہیں۔ طلبہ محسوس کرتے ہیں کہ فرنچ اور جرمن اگرچہ ان کی زبانیں نہیں ہیں اور ہندوستان میں یہ کہیں بولی بھی نہیں جاتیں، پھر بھی ان زبانوں کی روح ان کے ادب کی تفہیم میں انھیں اس لیے سہولت ہوگی کیوں کہ ان زبانوں کے مطالعے کے لیے وہ سب کچھ موجود ہے جو کسی بھی زبان کی تعلیم کو مثالی بناتا ہے۔ جب ان غیر ملکی زبانوں میں ایک دفعہ طلبہ کی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے تو ان کے لیے نہ صرف کلاس روم کی تعلیم کا حصول آسان ہو جاتا ہے بلکہ متعلقہ سرگرمیوں مثلاً ٹرم پیپرز (Term Papers)، ہفتہ وار ٹیسٹ اور سالانہ امتحان میں بھی ان کی کارکردگی کہیں بہتر ہوتی ہے، جو اولاً ان طلبہ کے لیے کسی بھی اچھی یونیورسٹی کے بی.اے. آنرز کورس میں داخلے اور بعدہٗ بہتر کیریئر کے مواقع کی ضامن بن جاتی ہے۔ اچھی یونیورسٹیوں میں ان غیر ملکی زبانوں کے گریجویٹ کورسز میں طلبہ کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ انھیں اچھی نوکریاں بھی بہ آسانی مل جاتی ہیں اور اردو گریجویٹوں کے مقابلے میں ان کے حالات بھی کہیں بہتر ہوتے ہیں۔ دہلی جیسے شہر میں بھی کسی انگلش میڈیم اسکول کو جرمن یا فرنچ جیسی زبانوں کے اساتذہ کے تقرر کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، غیر ملکی زبانوں کے ان ٹیچروں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے اضافی رقم بھی خرچ کرنی پڑتی ہے اور بالعموم یہ لوگ ہفتے میں صرف تین دن ہی پڑھانے آتے ہیں۔ غیر ملکی زبان کا ٹیچر علاحدہ سے سیاحوں کے لیے ترجمان اور مختلف ایجنسیوں کے لیے مترجم کے طور پر کام کرکے بھی اچھی خاصی کمائی کر لیتا ہے۔

ہر اردو اخبار اور رسالے میں ایسے مضمون چھپتے رہتے ہیں کہ کیا اردو کو روزگار سے جوڑنا چاہیے؟ ان میں کہی گئی تمام باتیں شاعرانہ تخیل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ان مضامین کے لکھنے والوں کو بازار کی طاقت اور ہندوستان کے بدلتے اقتصادی اور سماجی منظرنامے کا کچھ اندازہ نہیں۔ تعلیم اور مبادیاتِ تعلیم پر انھوں نے کبھی نہیں سوچا۔ یہ مضامین محض خلط مبحث کو جنم دیتے ہیں۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے ان بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر جن کی مادری زبان اردو ہے، اچھی کتابیں اور عمدہ تدریسی مواد فراہم کیا جانا ضروری ہے اور انگلش میڈیم اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے مسائل کو بھی اردو تعلیم کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے اہلِ فکر کو اپنی ترجیحی فہرست میں شامل کرنا چاہیے۔ اب تک اردو معاشرے کے مباحث کا تمام زور صرف اردو میڈیم تعلیم پر رہا ہے (عمل وہاں بھی صفر ہی ہے اور وہی حال فہم کا ہے۔)

معاصر ہندوستان کے انگلش میڈیم اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا سوال کسی بھی طرح کم اہمیت کا حامل نہیں کیوں کہ وہاں بھی اب اردو مادری زبان والے بچے بڑی تعداد میں پڑھتے ہیں اسی لیے، اس تحریر میں مباحث کا مرکزی نقطہ انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو کی تعلیم ہے۔

عام رجحان اب یہی ہے کہ والدین خواہ ان کا اپنا تعلیمی وتہذیبی پس منظر کچھ بھی ہو، اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے اگر ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے لیے اردو زبان کا تدریسی مواد موجود نہیں ہے تو ہمیں مزید وقت برباد کیے بغیر اسے فوراً تیار کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

ایک اختیاری مضمون کے طور پر اردو پڑھنے کے خواہش مند طلبہ کے لیے (اور دیگر پڑھنے والوں کے لیے بھی) پہلے سے موجود اس تدریسی مواد کا جائزہ بھی کم اہم موضوع نہیں جو اردو کے ان اہم شاعروں سے تعلق رکھتا ہے جن میں عظمت کے لحاظ سے زمان ومکاں کی قید سے ماورا شاعر غالب بھی شامل ہیں۔ غالب اور ان کی شاعری اور شخصیت پر بھی ہندوستان میں اسکول کے طلبہ کے لیے ڈھنگ کی ایک کتاب موجود نہیں ہے۔ اچھے اسکولوں کے طلبہ کو ذہن میں رکھ کر غالب کی شاعری کا کوئی ایڈیشن تیار ہی نہیں کیا گیا۔ یہی حال مہماتِ غالب کا ہے جو کسی بھی طرح اسکولوں میں زیرِ تعلیم طلبہ کی ضروریات کے مطابق نہیں۔ غالب جیسے عظیم شاعر پر جدید زمانے کی تدریسی ضرورتوں کے مطابق جس طرح کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹس ہونی چاہیے تھیں ان کا بھی سرے سے کوئی وجود نہیں، یہ کام کرنے کا خیال زعمائے اردو کو کبھی نہیں آیا۔ لے دے کر گلزار

کے ٹی وی سیریل غالب کے سوا اردو طلبہ کی دلچسپی کے لیے ایسی کوئی چیز موجود نہیں جیسی دوسری زبانوں میں معاون تدریسی مواد کے طور پر بہ کثرت موجود ہوتی ہیں۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کی تدریس کے لیے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس خاص طور پر نہ صرف تیار کیے جاتے ہیں بلکہ انھیں ہر برس اپ ڈیٹ بھی کیا جاتا ہے۔ گلزار کا یہ اتفاقیہ طور پر موجود سیریل تقریباً ایک دہے قبل کاروباری ضرورت کے پیشِ نظر بنایا گیا تھا۔ بہت کھینچ تان کر اس فہرست میں اسماعیل مرچنٹ کی فلم ''محافظ'' کو شامل کیا جاسکتا ہے جو انیتا ڈیسائی کے ناول In Custody پر مشتمل ہے اور جس میں اردو کے ایک بزرگ شاعر کے بدترین معاشی حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ اردو معاشرے کی Stereotype کی عکاس یہ فلم بھی ہندوستان میں اب دستیاب نہیں۔ شیکسپیئر پر (غالب کی عظمت جس سے کسی طرح کم درجے کی نہیں) ہر عمر کے طلبہ کے لیے بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں اور سینکڑوں طرح کی ایسی آڈیو ویڈیو کیسٹس ہندوستان کے بازار میں موجود ہیں جنھیں مسلسل اپ ڈیٹ کیا جاتا ہے۔ انٹرنیٹ پر معاون مواد کا موجیں مارتا سمندر الگ ہے۔

اردو نصاب کے اس مجوزہ پروجیکٹ کے لیے جدید شاعروں سے متعلق حصے میں میری اولین ترجیح اختر الایمان ہیں اور ان ہی کے ساتھ میراجی اور ن م راشد بھی۔ ساحر لدھیانوی کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ ہر نسل کے نوجوانوں میں غالب اور اقبال سے یا اردو اور ہندی کے کسی بھی شاعر سے کہیں زیادہ پڑھے جانے والے شاعر ہیں۔

اسکول کے نصاب کا مسئلہ یا یوں کہیں کہ اسکول کے نصاب میں اردو کی شمولیت کا اردو کلچر اور گلیمر کی بحث سے کچھ تعلق نہیں۔ ویسے اب تک اردو والے اردو کلچر اور گلیمر کی بحثیں ہی کرکے مجموعی طور پر ہر برس کروڑوں روپے سیمیناروں کے نام پر خرچ کر دیتے ہیں۔ اردو زبان کے سیاسی و سماجی محرکات سے دلچسپی رکھنے والے طالب علم کے طور پر میری رائے یہی ہے کہ ہندوستان میں اردو صرف اسکولوں کے نظام کے ذریعے ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ دورِ جدید میں اسکول ہی وہ ادارہ ہے جو کسی بھی مضمون میں بنیادی علم کو رواج دے کر اس کی آئندہ بلند عمارت کی تعمیر کی راہ ہموار کرسکتا ہے۔ دینی مدارس میں جو اردو مذہبی نصاب کا ذریعۂ تعلیم ہے اس کا مقصد اور ماحصل چونکہ دونوں ہی مختلف ہیں، اسی لیے، میں نے دینی مدارس کے کسی زاویے پر اس تحریر میں گفتگو نہیں کی اور اس تحریر کو انگریزی میڈیم اسکولوں کے نظام میں اردو نصاب کے سوال تک ہی محدود رکھنے کی سعی کی ہے۔ دینی مدارس اور اردو کے رشتوں نیز دینی مدارس کی سماجیات پر میری نظر ہے مگر اس تحریر میں اس گفتگو سے عمداً گریز کیا گیا ہے۔

میں ہندوستان میں اسکولوں کے نصاب — جس کے لیے سیکولر نصاب کی اصطلاح عام طور پر استعمال کی جاتی ہے — میں اردو کی تعلیم کے متعلقہ پہلوؤں کے بارے میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا ہوں۔ فی الحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہندوستانی اسکولوں کے نظام یا نصابِ تعلیم کو سیکولر کہنا کس حد تک درست ہوگا؟ یہاں لفظ اسکول کا مفہوم، استعمالِ عام کے مطابق ان اداروں تک محدود ہے جو ثانوی تعلیم یعنی سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری سطح کے امتحان لینے والے بورڈوں سے الحاق شدہ ہیں۔ ہندوستان میں اس نظام کے تحت ایک بچہ 15 سال کی عمر کو پہنچنے پر پہلے پبلک اگزامنیشن میں بیٹھ سکتا ہے جو بالعموم دسویں درجے کا امتحان ہوتا ہے اور جسے بعض صوبوں میں ہائی اسکول یا میٹریکولیشن کا امتحان بھی کہا جاتا ہے۔ CBSE میں اب دسویں کلاس کے امتحان کو اختیاری کرکے تقریباً ختم کیا جارہا ہے، سینئر سیکنڈری یا انٹرمیڈیٹ (ماضی کا پری یونیورسٹی کورس) کے امتحان کے لیے اب عمر کی قید کم از کم 17 سال ہے۔ اپنے طالب علموں کو پبلک اگزامنیشن میں شریک کرانے کا اختیار ہندوستان میں صرف ان اداروں یا اسکولوں کو ہے جو کسی بھی بورڈ سے الحاق کے وقت یہ بیان حلفی دیتے ہیں کہ ان کا کسی طرح کی مذہبی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

موٹے طور پر ہندوستان کا تعلیمی نظام دو بڑے زمروں میں تقسیم ہے جو آج بھی ہمارے سماج کو طبقوں میں بانٹنے کی نوآبادیاتی فکر کا غماز ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں انگریزی کی موجودگی اور اس کی اہمیت پر ہونے والی بحث بھی بنیادی طور پر تعلیم کے ذریعے ہندوستان کے سماج کو طبقوں میں تقسیم کرنے کی بحث ہے۔ عمومی صورتِ حال یہ ہے کہ تمام ریاستی بورڈ عام طور پر متعلقہ ریاست کی سرکاری زبان (جو بالعموم اس ریاست کی اکثریت کی مادری زبان ہوتی ہے) میں امتحانات لیتے ہیں۔ تکنیکی لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ کسی بھی زبان کو صوبے کی سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے ریاستی اسمبلی نے جو بل پاس کیا ہے، اس میں، اور بعد میں بل کو گزٹ میں درج کرتے وقت تعلیم کے مقصد کے لیے اس زبان کے استعمال کی وضاحت کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ اس مقصد کو نوٹیفائی بھی کیا گیا ہو۔ وہ زبان اُس صوبے کے ایجوکیشن کوڈ میں تسلیم شدہ ہو، یہ بھی ضروری ہے۔ کسی زبان کو محض (اصطلاحاً) سرکاری پہلی یا دوسری زبان قرار دے دینے سے اس زبان کو عام امتحانات یا تعلیم کا میڈیم بننے کا اختیار حاصل نہیں ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر اتر پردیش میں 1989 میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا تھا لیکن ریاستی قانون سازیہ کے منظور شدہ ایکٹ کے مقررہ مقاصد میں اور بعد میں گزٹ نوٹی فکیشن میں بھی اردو کو تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی صراحت نہیں کی گئی، اس لیے،

اتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا یہ درجہ اردو تعلیم کے مقاصد کے حصول میں کسی طرح معاون نہیں ہوا اور اسکولی سسٹم میں تعلیم پانے والا کوئی بچہ اردو کو اپنی زبان قرار دینے کے باوجود اپنی تعلیم کے مراحل میں اس ایکٹ کا کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ یوپی میں اردو مادری زبان والے جو بچے اسکول جاتے ہیں وہ صد فی صد ہندی میڈیم سے دسویں اور بارھویں درجے کا امتحان اس لیے دیتے ہیں کیوں کہ یوپی کے ایجوکیشن کوڈ میں اردو شامل ہی نہیں ہے۔

سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن اور انڈین کونسل آف اسکول ایجوکیشن جو پہلے اینگلو اینڈین بورڈ کہلاتا تھا، دونوں دہلی میں واقع ہیں۔ سی.بی.ایس.ای. پورے ملک میں زیادہ سے زیادہ 10 فیصد اسکولی بچوں کا امتحان لیتا ہے۔ یعنی سی.بی.ایس.ای. بورڈ سے جو اسکول ملحق ہیں ان میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد ہندوستان میں اسکول جانے والے بچوں کی مجموعی تعداد کا دس فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ سی.بی.ایس.ای. سے دہلی حکومت کے تمام اسکول بھی ملحق ہیں۔ دہلی میں موجود دیگر تمام اسکولوں کی اکثریت بھی سی.بی.ایس.ای. ہی سے ملحق ہے۔

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اسکول جانے والے تقریباً نوے فیصد بچے صوبائی بورڈوں سے اور علاقائی زبانوں کے میڈیم میں دسویں اور بارھویں کا امتحان دیتے ہیں۔ جو بچے کسی وجہ سے اسکول میں اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ پاتے ان کے لیے غیر رسمی تعلیم کے ادارے مثلاً نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن لرننگ (ماضی کا نیشنل اوپن اسکول) وغیرہ اپنا رول ادا کرتے ہیں۔

ماضی کے اینگلو انڈین بورڈ کے نام سے مشہور آئی.سی.ایس.ای. شاید اس لیے بہتر بورڈ مانا جاتا ہے کیوں کہ اس سے وابستہ اسکول صرف انگریزی میڈیم کے اسکول ہیں۔ ان میں اکثریت عیسائی مشنری اسکولوں کی ہے۔ اس کے باوجود آئی.سی.ایس.ای. سے ملحق اسکولوں میں ان بچوں کا بھی بمشکل تمام ایک فیصد زیر تعلیم ہے جو انگریزی میڈیم سے پڑھتے ہیں۔ نوآبادیاتی حکمرانوں کی ذہنی وراثت کے حامل آئی.سی.ایس.ای. سے ملحقہ اسکولوں کا مقصد انگریزی داں طبقے کو غیر انگریزی داں طبقے سے ممتاز مقام دے کر طبقاتی تقسیم کے تسلسل کو برقرار رکھنا ہے۔ اس ذہنیت اور خلیقے کے اسکول میں صرف ان خاندانوں کے بچوں کو داخلہ دیا جاتا ہے جو انگریز حکمرانوں کی خدمت پر (چھوٹے یا بڑے عہدوں پر) مامور رہے۔

اس ذہنیت کا سب سے ممتاز نمائندہ دہرہ دون کا دون اسکول ہے۔ نوآبادیاتی خلیقے کا یہ ادارہ 65 ایکڑ زمینی رقبے پر بنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اسکول کے تمام وسائل عوامی سرمائے سے ایک بہت چھوٹے طبقے کے وجود کو قائم رکھنے کی غرض سے برسر اقتدار طبقے نے یہ مہتم بالشان ادارہ قائم کیا۔ ایک روپے فی ایکڑ کی سرکاری قیمت سے اس اسکول کے لیے زمین حاصل کی گئی تھی۔ بعد میں تعمیر اور وسائل فراہم کرنے کے مراحل میں بھی غریب عوام کے پیسے سے ہی اسکول کو شکوہ میسر آیا۔ یہ مکمل طور پر اقامتی ادارہ ہے۔ اس اسکول میں ہر سال صرف ان 70 طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے جن کے والدین اقتدار کے سلسلۂ مراتب میں مقتدر ہیں۔ ان 70 طلبہ میں 50 طلبہ کو ساتویں درجے میں اور 20 طلبہ کو آٹھویں کلاس میں داخل کیا جاتا ہے۔ 70 بچوں کے انٹیک (Intake) میں اسکول اسٹاف کے بچے بھی شامل ہوتے ہیں۔ طبقاتی تقسیم کے تابع اس اسکول میں اسٹاف کے بچوں کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ صرف اساتذہ اور برسر (Bursur) کے بچے ہی اسٹاف کے بچوں کے زمرے میں شامل ہوکر دون اسکول میں داخلے کے مجاز ہوں گے۔ اس اسکول کی 40 فیصد نشستیں اسکول کے فارغین یعنی ماضی کے حکمرانوں کے بچوں کے لیے مخصوص ہیں۔ دون اسکول میں کل ملا کر تقریباً 500 طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس اسکول میں ابھی بھی مخلوط نظام تعلیم شجر ممنوعہ ہے۔

ہندوستان میں اسکول کی تعلیم کے اس پیچیدہ پس منظر میں، اسکولی سطح پر اردو تعلیم میں مددگار ثابت ہونے والا ہر قسم کا تدریسی مواد تیار کرنا ایک دقت طلب کام ہے۔ لیکن اگر اردو کو زندہ رکھنا ہے تو یہ کام بہرحال کرنا ہوگا۔ اگر آپ اردو کی اسکولی تعلیم کے لیے کسی بھی طرح کا کوئی قابل عمل منصوبہ تجویز کرسکیں تو ذاکر حسین اسٹڈی سرکل اس کے لیے سرمایہ فراہم کرسکتا ہے۔

□□□

پتہ:
80, Sukhdev Vihar, Mathura Road,
New Delhi

● بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

خالد محمود

اردو میں ترجمہ نگاری

میر کے نام سے منسوب ایک شعر ہے:

غزل کہنی نہ آتی تھی تو سو سو شعر کہتے تھے
مگر اک شعر بھی اے میر اب مشکل سے ہوتا ہے

کچھ یہی حال ترجمے کا ہے۔ جنھیں ترجمہ کرنا نہیں آتا وہ بے جھجک ترجمے کرتے رہتے ہیں اور اس دشوار عمل میں کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں کرتے ہر کس و ناکس نے اپنے آپ کو اس فن دقیق سے عہدہ برآ ہونے کا اہل تصور کرلیا ہے۔ اس غلط تصور کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ سیکڑوں مہمل، بے ربط اور مضحکہ خیز کتابیں منظر عام پر آ کر علم و ادب کے انحطاط کا سبب بن رہی ہیں، بالکل وہی معاملہ ہوا:

غزل کہنی نہ آتی تھی تو سو سو شعر کہتے تھے

اس قسم کے تراجم کی بے شمار مثالیں سستے ناولوں سے لے کر درسیات کی مہنگی کتابوں تک بآسانی مل جاتی ہیں۔ اس قبیل کی کسی بھی کتاب کو آنکھیں بند کر کے اٹھایئے اور آنکھیں کھول کر اس کا مطالعہ کیجیے، ترجمے کی کم عیاری پہلی ہی نظر میں آپ پر آشکار ہو جائے گی۔

ترجمے کی ایک لازمی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ مترجم کو کم از کم اُس موضوع اور ان دونوں زبانوں سے پوری واقفیت ہونی چاہیے جن میں الفاظ و معانی اور مفاہیم کی سطح پر تبادلہ کیا جا رہا ہو۔ مختلف کتابوں خصوصاً نصابی کتب کے تراجم دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں زبانوں سے پوری واقفیت تو کجا مترجمین کو ان زبانوں کی شدبد بھی مشکل سے ہوتی ہے۔ کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ مترجم صرف ایک زبان جانتا ہے وہ بھی کم کم اور کہیں اس افسوسناک حقیقت کا احساس و ادراک ہونے لگتا ہے کہ ترجمہ کرنے والا دونوں ہی زبانوں اور متعلقہ مضمون سے بہت معمولی واقفیت رکھتا ہے۔ ایک عبرتناک بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ وہ شخص جس کا نام مترجم کی حیثیت سے کتاب کے سرورق یا پہلے صفحے پر درج ہوتا ہے، خود ترجمہ کرنے کے بجائے اپنے کسی نوآموز طالب علم یا کسی کم علم عزیز کو معاوضے کی رقم کا ایک حقیر سا حصہ دے کر ترجمہ کرا لیتا ہے، باقی رقم اپنے نام کی قیمت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ دوسری صورت یہ بھی ہے کہ وہ شخص جس کا نام کتاب کے اوپر جلی حروف میں درج ہے خود بھی ترجمہ کرنے کا اہل نہیں ہوتا لیکن اپنے تعلقات یا دیگر وسائل کے ذریعے ترجمے کا منفعت بخش کام حاصل کر لیتا ہے۔ ان حالات میں جو ترجمے وجود میں آتے ہیں ان کی حیثیت معلوم! اس پر طرہ یہ کہ جب آپ ایسے کسی نام نہاد مترجم سے گفتگو کریں تو وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرے گا کہ اس سے بہتر ترجمہ خیال ہی میں نہیں آ سکتا۔ ادبی بددیانتی کی ایسی سفاکانہ مثالیں آئے دن دیکھنے میں آتی ہیں، جو اہل زبان ترجمے کی مشکلات کا علم رکھتے ہیں اور جنھیں اس کے فنی پہلوؤں کی نزاکتوں اور باریکیوں سے واقفیت ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس راہ سے سلامت گزر جانا ممکن تو ہے مگر سہل نہیں۔ استثنائی صورتوں سے قطع نظر کامیاب سے کامیاب ترجمہ نگار بھی اصل کتاب کا حق ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے غالباً اسی لیے بعض مفکرین نے ترجمے کے عمل کو سعی لاحاصل سے تعبیر کیا ہے۔ مثال کے طور پر اٹھارھویں صدی کے مشہور انگریز نقاد ڈاکٹر جانسن کا خیال ہے کہ ''شاعری ترجمے کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔'' انیسویں صدی کے ایڈورڈ جیرالڈ نے بڑی دلچسپ استعاراتی زبان میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں'' زندہ کتا مردہ شیر سے بہتر ہے۔'' بیسویں صدی کے رابرٹ فراسٹ کہتے ہیں'' ترجمہ ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی ہے'' مگر یہ تمام آرا تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کرتی ہیں، تصویر کا دوسرا رُخ یعنی ترجمے کا تابناک پہلو ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے یا کم از کم مذکورہ بالا رایوں میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ فرانسیسی نژاد امریکی پروفیسر ہیلیر ڈ کیرالڈ اپنی مشہور تصنیف ''مقدمۂ عالم'' میں ترجمے کے اس تابناک رُخ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عالمی حقیقت کو عالمگیر حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔''

اور گوئٹے کا خیال ہے:

''جملہ امور میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں، ان میں ترجمہ بھی شامل ہے۔''

یہ اور ایسی بہت سی رائیں ہیں جو ترجمے کی پُرزور وکالت کرتی ہیں اور ان رایوں سے بھی زیادہ طاقت ور تائید و حمایت اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ ہر زبان کے بیشتر بڑے تخلیق کاروں نے اپنے پسندیدہ فنکاروں کی تخلیقات کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجموں ہی کا فیض ہے کہ آج ہم دنیا کی چھوٹی بڑی مختلف زبانوں کے ادیبوں سے واقف ہیں اور ان کی تخلیقات سے اسی طرح اکتساب فیض کر رہے ہیں جس طرح خود انھوں نے دوسری زبانوں سے کیا تھا ورنہ کہاں اردو کا قاری اور کہاں لاطینی، عبرانی، یونانی، سریانی، پہلوی، عربی اور سنسکرت

کے ادیب و شاعر۔

بات ترجمے کی دشواریوں سے چلی تھی یہ دشواریاں وہی محسوس کرتے ہیں جو اس فن کی شرائط پوری کرنے کا جتن کریں وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہی وہ صداقت ہے جو زبان حال سے میر کا دوسرا مصرع گنگناتی رہتی ہے۔

مگر اک شعر بھی اے میر اب مشکل سے ہوتا ہے

اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر وہ کیا عوامل ہیں جو اچھے ترجمے کو ایسا دشوار بنا دیتے ہیں کہ باعتبار معیار سو میں سے نوے ترجمے مسترد کیے جانے کے لائق ہو جاتے ہیں۔

ترجمہ خط مستقیم پر چلنے والا فن نہیں ہے، اس لیے اس فن پر گفتگو کرتے ہوئے اگر ایک طرف اس کے مطالبات زیر بحث آئیں گے، شرائط پر بات ہوگی، کتاب کے انتخاب سے لے کر الفاظ و اصطلاحات، روزمرّہ و محاورے، اور اسالیب بیان کا بھی ذکر چلے گا تو دوسری جانب اس سوال کا جواب بھی تلاش کرنا ہوگا کہ ترجمہ آخر کیوں؟

بہتر ہوگا کہ دوسرے سوال پر پہلے غور کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس نقل درنقل کی آخر ضرورت کیا ہے؟

ترجمے کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے اور اس کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''دنیا میں ہر قوم کی زندگی میں ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ اس کے قوائے ذہنی میں انحطاط کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ ایجاد و اختراع اور غور و فکر کا مادّہ تقریباً مفقود ہو جاتا ہے، تخیل کی پرواز اور نظر کی جولانی تنگ اور محدود ہو جاتی ہے۔ علم کا دارومدار چند رٹی باتوں اور تقلید پر رہ جاتا ہے۔ اس وقت قوم یا تو بے کار اور مردہ ہو جاتی ہے یا سنبھلنے کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کا اثر قبول کرے۔''

آگے لکھتے ہیں:

''جس طرح یونان کا اثر روما اور دیگر اقوام یورپ پر پڑا، جس طرح عرب نے عجم کو اور عجم نے عرب کو اپنا فیض پہنچایا، جس طرح اسلام نے یورپ کی تاریکی اور جہالت کو مٹا کر علم کی روشنی پہنچائی اسی طرح آج ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں۔ یہ قانون الٰہی ہے جو یوں ہی جاری رہا اور جاری رہے گا۔ ہمیشہ دیے سے دیا جلتا رہا ہے۔ جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہے۔ اس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمے کے ذریعے دنیا کی اعلیٰ درجے کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے۔ جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر یہی ترجمے تصنیف و تالیف کے نئے ڈھنگ سجھائیں گے۔ ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف و تالیف سے زیادہ قابل قدر، زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے۔''

(مقدمات، حصہ دوم)

مولوی عبدالحق کے اس طویل اقتباس سے ترجمے کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کا صحیح احساس و اندازہ ہو جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ترجمے کے فن پر گفتگو کرنے کی منزل آ جاتی ہے۔

''فرہنگ آصفیہ'' اور اردو کی دوسری لغات میں ترجمے کی معنی ہیں ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کیا ہوا مگر John T. Platts نے اپنی مشہور ڈکشنری میں ترجمے کے لیے Translation کے ساتھ ساتھ Interpretation کا لفظ بھی درج کیا ہے جس کے معنی تشریح، توضیح، تعبیر اور تصریح ہیں۔ اردو کے تمام لغات میں ترجمے کی ''ج'' پر فتحہ کا نشان ہے البتہ فرہنگ عامرہ میں ''ضمہ'' ہے۔

فن ترجمہ نگاری کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اچھا ترجمہ عموماً تخلیقی ہوتا ہے۔ ترجمے سے ان افراد کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے جو دوسری زبانیں نہیں جانتے۔ چنانچہ غیر زبان کے مفاہیم کو اپنی زبان میں بیان کرنا ترجمے کا پہلا مقصد ہے۔ یہ ایک اعتبار سے بازیافت کا عمل ہے اور اسی لیے ترجمہ تخلیق سے زیادہ لیاقت کا طلب گار ہوتا ہے۔ مترجم کی ذمے داری تخلیق کار سے اس طرح بڑھ جاتی ہے کہ تخلیق کار کے لیے صرف کسی ایک زبان کا جاننا کافی ہوسکتا ہے مگر مترجم کو کم از کم دو زبانوں کا عالم ہونا ازبس ضروری ہے۔

ترجمے کی تین قسمیں ہیں۔ علمی ترجمہ، ادبی ترجمہ اور صحافتی ترجمہ۔ ان قسموں کے تحت یا تو لفظی ترجمہ ہوگا یا آزاد یا ان دونوں کے درمیان سے کوئی متوازن تخلیقی راہ نکالی جائے گی۔

علمی ترجمے کے ذیل میں جغرافیہ، تاریخ، ریاضی، معاشیات، قانون، طب، طبیعیات اور سائنسی علوم و فنون سے تعلق رکھنے والی تمام تحریریں شامل ہیں۔ علمی ترجمہ عام طور پر لفظی ترجمے کے دوش بدوش چلتا ہے۔ اس میں ضروری ہے کہ کسی لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک مقام پر کیا جائے وہی ہر جگہ استعمال میں لایا جائے تا کہ ترجمے میں یکسانیت برقرار رہے۔ علمی اصطلاحات وضع کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اصطلاحیں مسلمہ اصول کے مطابق ہوں۔ مولوی وحیدالدین سلیم نے اپنی کتاب ''وضع اصطلاحات'' میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اگر اصطلاحیں نہ ہوں تو ہم علمی مطلب کے ادا کرنے میں طویل و لاطائل گفتگو سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ جہاں ایک چھوٹے سے لفظ سے کام نکل سکتا ہے وہاں بڑے بڑے جملے لکھنے پڑتے ہیں اور ان کو بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ اصطلاحیں درحقیقت اشارات ہیں جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کردیتی ہیں۔''

ادبی ترجمہ نسبتاً زیادہ مشکل کام ہے۔ یہ ترجمہ علمی ترجمے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زبان کا تخلیقی اور بامحاورہ استعمال کیا جائے تاکہ ایسا ادبی حسن پیدا ہوسکے کہ ترجمے پر طبع زاد تخلیق کا گمان گزرے۔

صحافتی ترجمہ عام حالات میں کھلا ہوا اور آزاد ہوتا ہے۔ اس میں ایک زبان کے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ انتقال مفاہیم میں چونکہ کسی خاص پابندی کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، اس لیے یہ ترجمہ نسبتاً آسان ہے۔ ترجمہ کے دوران سب سے مشکل مرحلہ صحیح اور مناسب ترین الفاظ کی تلاش ہے۔ ہر لفظ کا اپنا ایک نظامِ عمل ہے جس میں مختلف اور بعض اوقات متضاد جہتیں اور زاویے پیدا ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح لغوی معنی کے علاوہ ہر لفظ اپنی تہذیبی، سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی پہچان بھی رکھتا ہے۔

یہی حال مترادفات کا ہے ترجمہ نگار کو مترادفات کے استعمال میں بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اس معاملے میں بآسانی دھوکا کھایا جاسکتا ہے۔ اس خاص معاملے میں صرف زبان دانی کافی نہیں ہوتی بلکہ زبانوں کا مزاج داں ہونا بھی ضروری ہے۔ ہر لفظ اپنے لغوی، اصطلاحی، مرادی اور تخلیقی معنی کے ساتھ اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے۔ سید باقر حسین نے اپنے مضمون ''ترجمے کے اصول'' مطبوعہ ''ماہِ نو'' کراچی میں اس بات کو ایک اچھی مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''عریاں، برہنہ، ننگا بظاہر ہم معنی ہیں لیکن ان کے محل استعمال پر غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بہت فرق ہے۔ لفظ برہنہ میں حقیقت اتنی بے لباس نہیں ہے جتنی کہ ''ننگا'' میں ہے اور لفظ ''عریاں'' میں اس سے بھی کم ہے۔ اگر کہا جائے کہ ''بچہ ننگا ہے'' تو یہاں اس لفظ کا استعمال بالکل برمحل ہے۔ خیال فرمایئے کہ بچہ برہنہ یا عریاں کہنے میں کس قدر ثقل اعوذیت پائی جاتی ہے لیکن جب مرد یا عورت کا ذکر آئے تو بہ لحاظ حاجتِ ستر لفظ برہنہ یا عریاں استعمال کرنا بالکل درست ہوگا۔ البتہ اگر پاگل مرد یا عورت کا معاملہ ہو تو اس کو عریانیت کا تیسرا درجہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ مطلق الفاظ کا ترجمہ ہو یا عبارت کا، اس وزنِ اضافی کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔''

مختلف مباحث اور حوالوں کی روشنی میں ترجمہ نگاری کے جو اصول و ضوابط مرتب کیے جاسکتے ہیں ان کے مختصر ترین نکات کچھ اس طرح ہیں:

1. مترجم کے لیے لازمی ہے کہ جب علمی اور خصوصاً نصابی کتاب کا ترجمہ کرے تو ہر لفظ کے لیے ہر جگہ ایک ہی لفظ استعمال کرے تاکہ یکسانیت قائم رہے اور کسی بھی قسم کا اشکال پیدا نہ ہو۔ مثلاً انگریزی لفظ ڈیفنیس کا ترجمہ دفاع کیا گیا ہو تو ہر جگہ یہی لفظ استعمال کرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ کہیں دفاع کہیں تحفظ اور کہیں حفاظت استعمال کرنے لگے۔

2. علمی کتاب کے ترجمے میں اصطلاحات پر خصوصی توجہ اور صحیح لفظ کی تحقیق و تلاش اور دقت نظر سے کام لینا چاہیے۔

3. لفظوں کے متبادل اور مترادفات تلاش کرنے میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسا لفظ منتخب کیا جائے کہ اس سے مشتقات بھی وضع کیے جاسکیں، مثلاً ایڈمنسٹریشن کا ترجمہ انتظام ہوسکتا ہے اور اس سے تنظیم، تنظیمی، منظم، انتظامی، انتظامیہ اور منتظم جیسے الفاظ بھی مشتق کیے جاسکتے ہیں۔

4. کسی اصطلاح کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ لحاظ رکھا جائے کہ اردو میں بھی وہ لفظ اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہو، تشریح کی نہیں۔

5. اگر اردو میں کسی انگریزی لفظ کے لیے پہلے سے کوئی لفظ موجود و مستعمل ہے تو نیا لفظ بنانے کی جگہ اس کو رائج کرنا مناسب ہوگا۔ ''بل آف ایکس چینج'' کے لیے پہلے سے ایک لفظ ''ہنڈی'' موجود ہے۔

6. بہت سے انگریزی الفاظ اردو کا جزو بن چکے ہیں، انھیں جوں کا توں رہنے دیا جائے مثلاً رجسٹری، ڈاک ٹکٹ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اسٹیشن، کمپیوٹر وغیرہ سیکڑوں الفاظ ہیں جن کے ترجمے کی ضرورت نہیں۔

7. اگر کوئی انگریزی اصطلاح اردو میں بھی اس معنی و مفہوم میں رواج پذیر ہے جس میں بزبان انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے تو اسے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ مناسب ہوگا کہ اس کو استعمال کریں۔ مثال کے طور پر کمیٹی کی اصطلاح جسے اردو میں ''مجلس'' کہتے ہیں جوں کی توں استعمال کی جاسکتی ہے۔ اسے مجلس سے بدلنا ضروری نہیں۔

8. ترجمے میں ایسے مقامی الفاظ کو بھی جگہ دی جائے جو موزوں اور مقبول عام ہوں۔ جہاں تک ممکن ہو اضافت اور ''حروف جار'' سے پرہیز کیا جائے۔ مثلاً ٹائم کلاک کا ترجمہ ''ریت گھڑی'' ہو ''ریت کی گھڑی'' نہ ہو۔

9. مختصرات یعنی شارٹ فارم کا ترجمہ شارٹ فارم کی جگہ فل فارم میں کیا جائے۔ یہ چند اشارات ہیں ورنہ ترجمہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس کے مسائل اور مطالبات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مترجم کا مطالعہ، تجربہ، مشق اور ذوق سلیم ہی حقیقی رہنمائی کرسکتے ہیں۔

□□□

پتہ:
Deptt of Urdu, Jamia Millia Islamia,
Jamia Nagar, New Delhi

سرور الہدیٰ

خلیل الرحمٰن اعظمی کے تبصرے

میرے پیش نظر خلیل الرحمٰن اعظمی کے وہ تبصرے ہیں جو" ہماری زبان" (علی گڑھ) میں چھٹی، ساتویں دہائی کے درمیان شائع ہوئے۔ یہ تبصرے جن کتابوں پر لکھے گئے تھے ان میں سے زیادہ تر کتابیں آج ہمارے لیے اجنبی ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی زمانے میں لکھی گئی تمام کتابیں بعد والوں کے لیے اہم ہوں۔ ایسی کتابیں کم ہی ہوتی ہیں جو اپنے وقت کو عبور کرتے ہوئے آگے نکل آئی ہوں۔ جو کتابیں تاریخ کے بوجھ سے دب کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں ان کے بارے میں ماضی میں کیا کچھ لکھا گیا (یہ بھی ہمارے مطالعے کا ایک دلچسپ اور اہم پہلو ہے۔ اس سیاق میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے ان تبصروں کا مطالعہ ماضی قریب کے اس ادبی سرمائے سے آگاہ ہونا بھی ہے جسے وقت بڑی حد تک فراموش کر چکا ہے۔ میں نے یہاں ان تبصروں سے کوئی بحث نہیں کی ہے جو" مضامینِ نو" میں شامل ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہ تبصرے مختصر بھی ہیں اور طویل بھی، تبصرے کے اختصار اور طوالت کا تعلق کتاب کے متن سے ہے۔ یہ بات یوں تو بہت عام سی معلوم ہوتی ہے لیکن اسی میں تبصرہ نگار کی ذہانت اور دیانت داری کا راز پوشیدہ ہے۔ لوگ مروت اور مصلحت میں ایک صفحے کے تبصرے کو کئی صفحات تک پھیلا دیتے ہیں اور کبھی کئی صفحات کو ایک صفحے میں سمیٹ دیا جاتا ہے۔ صفحات کے کم یا زیادہ ہونے کا تعلق کتاب کے تعارف، تجزیے اور تفہیم سے ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے بیشتر تبصرے کتاب کے بنیادی تقاضوں کا لحاظ کرنے کے سبب آج بھی ہمارے لیے اہم ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر کتاب کو ایک پرشوق قاری کی طرح پڑھا کرتے تھے اس کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کا فیصلہ جلد بازی میں نہیں کرتے تھے۔ ان کا ذہن انتخابی تو تھا مگر ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ اپنے عہد کے تمام لکھنے والوں سے باخبر رہا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مختلف اسالیب کے تخلیق کاروں اور قلم کاروں کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا۔ لطف الرحمٰن نے اپنی تازہ کتاب" تنقیدی مکالمے" کے پیش آہنگ میں لکھا ہے۔" سچ تو یہ ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کی رحلت کے ساتھ ہی اردو تنقید میں غیر جانبداری اور سچائی کی روایت فوت ہوگئی۔" (تنقیدی مکالمے، ص-13)

لطف الرحمٰن کا دکھ یہ ہے کہ مجموعی اعتبار سے تنقیدی منظرنامہ تعصب کا شکار ہے۔ کچھ نقاد کسی کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں اور اپنی ذہانت سے ممدوح کے یہاں ایسی ایسی باریکیاں تلاش کر لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ لوگ بھی جو تنقید کی معروضیت پر بہت زور دیتے ہیں جب وقت تنقید و تجزیے کا آتا ہے تو ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے ان تبصروں کا مزاج مختلف ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصروں پر مشتمل کتاب" فاروقی کے تبصرے" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:

" یہ صحیح ہے کہ ہمارے یہاں تبصرے کی روایت بہت زیادہ جاندار نہیں رہی ہے اور تبصرے کا مقصد عام طور پر کتاب کا سرسری تعارف یا کچھ اشتہاری قسم کی رایوں کا اظہار ہوتا تھا اور اگر اس کے خلاف عمل ہوتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تبصرہ نگار کو مصنف یا کتاب سے کوئی پرخاش ہے اور یہ تبصرہ محض اس کتاب میں کیڑے نکالنے یا مصنف کی شہرت پر خاک ڈالنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ یعنی اس طور پر بھی تصویر کا ایک ہی رخ سامنے آتا تھا مگر ایسا بھی نہیں کہ ہمارے ہاں اچھے تبصرے لکھے ہی نہ گئے ہوں۔"

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اردو میں تبصرہ نگاری کی روایت کے حوالے سے مولوی عبدالحق، اختر حسین رائے پوری، جلیل قدوائی، عزیز احمد، آل احمد سرور رشید احمد صدیقی، محمد حسن عسکری، محمود ایاز کے تبصروں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ" محمد حسن عسکری کی بے لاگ تنقید اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔" خلیل الرحمٰن اعظمی کے ذہن میں تبصرہ نگاری کا جو تصور تھا اسے سمجھنے کے لیے خود ان کے تبصروں کا مطالعہ ضروری ہے۔ تنقید اور تبصرے کی زبان کیا ہونی چاہیے؟ اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن تمام لوگ کسی ایک نقاد کے اسلوب کو آئیڈیل قرار نہیں دیتے۔ کسی کے نزدیک کلیم الدین احمد کی زبان تنقیدی زبان کا معیاری نمونہ ہے تو کئی کے نزدیک یہ خشک اور بے رس ہے۔ آل احمد سرور کی تنقیدی زبان کو ہمارے عہد کے ایسے نقاد بھی پسند کرتے ہیں جن کی تنقیدی زبان کا کوئی رشتہ آل احمد سرور کی زبان سے نہیں، تو پسند اور ناپسند کا تعلق بھی خالص ادبی نہیں ہے۔ ایسے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے تبصروں کی زبان کس کے لیے معیاری ہے اور کس کے لیے غیر معیاری اس کا فیصلہ بہت مشکل ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے تبصروں کی زبان نہ تو بے کیف ہے اور نہ ہی محض تاثراتی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جن کتابوں پر تبصرے کیے تھے ان کا تعلق تحقیق سے بھی ہے۔ انھوں نے اگرچہ کسی ادبی متن کو کبھی مرتب نہیں کیا تھا اور نہ تحقیق کے سلسلے میں ان کی کوئی باضابطہ کارگزاری ہے، مگر ان تبصروں میں وہ ایک ذمے دار محقق کی طرح ترتیب متن اور تحقیق متن پر اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقیدی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار اس تحقیقی ذہن کا ہے جو انھیں

قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ کبیر احمد جائسی کی کتاب ''نقوش فانی'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دراصل جائسی صاحب فانی کے کلام کی طرف اپنی افتادِ طبع کے سبب کھنچے ہیں اور فانی کا دیوان ان کے لیے ایک ایسا سرمایہ ہے جس میں ان کے جذبات اور ان کے شخصی میلانات کی تسکین کا پورا پورا سامان موجود ہے۔ یہ کتاب فانی کے کلام کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے اور انھیں مسلمہ ادبی اصول پر رکھ کر پرکھنے کے لیے نہیں لکھی گئی ہے۔ بلکہ فانی کے نقطۂ نظر کو قبول کرکے ان کے ہم سفر بننے اور ان کی ذہنی فضا کو اپنے اندر رچانے بسانے کے لیے لکھی گئی ہے اس لیے اس کتاب سے ہم فانی کا ادبی مرتبہ متعین کرنے کے لیے مدد نہ لیں تو اچھا ہے۔ البتہ فانی کی شاعری کے بہت سے محاسن پر ہمیں غور کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔'' (ہماری زبان، 22 اکتوبر 1958)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے فانی کی شاعری سے کبیر احمد جائسی کی دلچسپی کو ان کا شخصی میلان قرار دیا ہے۔ تنقید میں شخصی میلانات کی تشریح کئی طرح سے کی جاسکتی ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم نقاد ہو جس کے یہاں اس کی افتادِ طبع در نہ آئی ہو۔ لہٰذا تنقید کو شخصی میلانات سے یکسر الگ کر پانا ممکن نہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے کبیر احمد جائسی کی افتادِ طبع کو فانی کے شعری مزاج سے ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فانی کی شاعری میں ایسے عناصر موجود ہیں جن سے کبیر احمد جائسی کے شخصی میلانات کو تقویت ملی، سوال یہ ہے کہ تنقیدی نقطۂ نظر سے اس ہم آہنگی کا جواز کیا ہے؟ اگر اس کا کوئی تنقیدی جواز نہیں ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کوئی باشعور قاری کیوں کر فانی کے متن کو اپنی ذات کا استعارہ سمجھنے پر مجبور ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے کبیر احمد جائسی کی افتادِ طبع کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے اس کی مثالیں ماضی اور حال میں دوسرے نقادوں کے یہاں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں ''فانی کے نقطۂ نظر کو قبول کرکے ان کے ہم سفر بننے اور ان کی ذہنی فضا کو اپنے اندر رچانے بسانے کے لیے لکھی گئی ہے۔'' کسی شعری متن کی ہم سفری بھی بڑی سعادت کی بات ہے جو متن کے گہرے مطالعے سے نصیب ہوتی ہے۔ اگر کبیر احمد جائسی نے فانی کے شعری متن کے ساتھ سفر کیا ہے اور اسے اپنے اندر رچایا بسایا ہے تو اس کا ایک روشن پہلو ضرور ہے۔ متن سے گہری وابستگی اگر تنقید و تجزیے کو معروضی اور سائنٹفک نہیں رہنے دیتی اور وجدان سے قریب کر دیتی ہے تو اسے تنقیدی نقطۂ نظر سے تعبیر کیا جائے گا تنقید سے نہیں۔ کسی شاعر کے شعری مزاج کو سمجھنے کے باوجود اس سے ایک فاصلہ قائم کرنا تنقید کے لیے ضروری ہے۔ مگر فاصلہ قائم نہ کرنے کے سبب تنقید داخلی تعبیر کا نمونہ بن جاتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے مطالعۂ فانی کو جس نظر سے دیکھا ہے وہ تنقیدی نقطۂ نظر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے نزدیک تاثرات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ شخصیات پر تاثراتی مضامین کی ایک خاص اہمیت ہے۔ میں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کے تبصروں میں جس بے باکی، صفائی اور توازن کا ذکر کیا ہے وہ ''مجلس'' کے مولوی عبدالحق نمبر پر ان کے تبصرے سے ظاہر ہے۔

''اس نمبر میں مولوی صاحب کے ادبی و تحقیقی کارناموں پر بہت کم مضامین ہیں۔ ''چند ہم عصر'' پر اسلوب احمد انصاری کے مضمون کے بعد خلیق انجم کے مضمون کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح مولوی صاحب کے اسلوب پر نثار احمد فاروقی کے تفصیلی تجزیے کے بعد ثمینہ شوکت کے سرسری مضمون کی شمولیت بے معنی نظر آتی ہے۔ کچھ مضامین ایسے ہیں جن کے عنوانات اہم ہیں مثلاً ''ڈاکٹر عبدالحق اور دکنیات'' (نصیرالدین ہاشمی)، ''عبدالحق کے تنقیدی تصورات'' (سیدہ جعفر)، ''اردوئے قدیم اور بابائے اردو'' (خواجہ حمیدالدین شاہد) لیکن ان مضامین کو پڑھنے کے بعد بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ نمبر مولوی صاحب کی زندگی اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے اور اس کا تاثراتی حصہ یقیناً یادگار رہے گا۔''

(ہماری زبان، صفحہ 15،12 اگست 1961)

مندرجہ بالا اقتباس کی تین باتیں اہم ہیں، ایک تو یہ کہ کسی عنوان سے اگر کوئی ایک مضمون پوری طرح انصاف کرتا ہے تو اسی حوالے سے دوسرے مضمون کی اشاعت کا کوئی مطلب نہیں ہے، جبکہ دوسرا مضمون پہلے کے مقابلے میں ہلکا اور سرسری ہو۔ دوسری بات کا رشتہ عنوانات سے ہے۔ اچھے عنوانات سے جب خراب مضامین سامنے آتے ہیں تو تکلیف ہوتی ہے۔ تیسری بات تاثرات کے تعلق سے ہے خلیل الرحمٰن اعظمی نے مولوی عبدالحق نمبر کے تاثراتی حصے کو یادگار قرار دیا ہے۔ مگر وہ اپنے تبصرے میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی کارگزاریوں کا جائزہ لینا باقی ہے۔ اچھے موضوعات پر خراب مضامین کے ساتھ ساتھ خلیل الرحمٰن اعظمی کتابوں کے نام کی سیاست کو بھی زیر بحث لاتے ہیں، شارق میرٹھی کی کتاب ''اردو شاعری کی روایات'' کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''کتاب کے نام سے غلط فہمی ہوسکتی ہے۔ ایسے نام جن سے مضامین کے مجموعے پر مستقل تصنیف کا دھوکا ہو ہمارے نزدیک مستحسن نہیں۔''

(ہماری زبان، ص 12، 15 فروری 1971)

کم و بیش تیس سال قبل خلیل الرحمٰن اعظمی نے متفرق مضامین پر مشتمل کتابوں کے نام پر جو اعتراض کیا تھا اس کی اہمیت اب کیسے زیادہ ہوگئی ہے۔ اس اثنا میں ایسی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو متفرق مضامین پر مشتمل ہیں مگر ان کے نام سے مستقل تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ لوگ مضامین کے مجموعے کا نام مستقل تصنیف جیسا کیوں رکھتے ہیں؟ اس کا ہمدردانہ جواب یہ ہے کہ وہ نام یا عنوان ان کی تحقیقی اور تنقیدی فکر کی نمائندگی کرتا ہے انھیں اس کا موقع نہیں مل سکا کہ کوئی مستقل کتاب لکھ سکیں۔ کسی کتاب میں دیباچے کی اہمیت اس وقت قائم ہوتی ہے جب اس کا براہ راست رشتہ متن سے

ہو۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے تبصروں میں دیباچے اور تعارف کو نظرانداز نہیں کرتے۔ لیکن ان کی اصل دلچسپی متن میں ہوتی ہے۔ اگر دیباچہ متن کی تشریح و تعبیر میں معاون ہے تو وہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ نذیر بناری کے شعری مجموعے ''گنگ و جمن'' کے تبصرے میں وہ لکھتے ہیں:

''گنگ و جمن پر سید احتشام حسین اور فراق گورکھپوری کے تعارف اور دیباچے ہیں۔ دونوں حضرات نے مروت سے کام لے کر رسمی مدح سرائی سے کام لیا ہے۔ اس نوع کے دیباچے مصنف اور قاری کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے بجائے کتاب سے متعلق شکوک اور الجھنوں میں اور اضافہ کردیتے ہیں۔ نذیر صاحب کی غزلیں بعض خامیوں کو علیحدہ کرکے خود پڑھنے والے کو متاثر کرسکتی ہیں لیکن یہ دیباچے کچھ ایسا تعصب پیدا کردیتے ہیں جس کا خمیازہ بے چارے شاعر کو بھگتنا پڑتا ہے۔

(''ہماری زبان'' ص 14-15، مارچ 1961)

احتشام حسین اور فراق گورکھپوری ہماری شاعری اور تنقید کے اہم نام ہیں لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی نے بے باکی کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کی تحریروں سے اختلاف کیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا اعتراف مدح سرائی پر ہے۔ مدح سرائی تنقید اور تبصرے میں کچھ نہ کچھ تو ہوتی ہی ہے لیکن اس کی کچھ علمی و ادبی بنیادیں بھی تو ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ عموماً متن کو ٹھیک سے پڑھا ہی نہیں جاتا۔ تبصرہ کرتے وقت دیباچے اور پیش لفظ پر نگاہ مرکوز ہوجاتی ہے یہ سب سے آسان نسخہ ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے مطابق تعارف اور دیباچہ بعض اوقات غلط فہمیوں کو راہ دیتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے فاروق بانس پوری کے شعری مجموعہ ''سوز و ساز'' کا جائزہ لیتے ہوئے بہت فکر انگیز اور دلچسپ گفتگو کی ہے۔ اس کتاب میں بھی کسی کا لکھا تعارف موجود ہے۔ تعارف نگار کا ایک اقتباس خلیل الرحمٰن اعظمی نے پیش کیا ہے۔

''مولانا مسعود عالم ندوی نے علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں آپ کی ابتدائی نظموں کا ایک مجموعہ بھیجا تھا۔ علامہ نے اپنے مکتوب مورخہ 28 مئی 1938 میں آپ کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا اس کے پیش نظر بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ دور حاضر میں کلام فاروق علامہ اقبال کی صحت امید کا روشن ثبوت ہے۔''

اس اقتباس کے جواب میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے۔

''ہماری اطلاع کے مطابق علامہ اقبال 21 اپریل 1938 کو رحلت فرما چکے تھے۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مرحوم نے 28 مئی 1938 کو جو مکتوب فاروق صاحب کی نسبت لکھا ہوگا وہ جنت الفردوس سے بھیجا گیا ہوگا۔''

(ہماری زبان، ص 12 یکم جون 1961)

اسی تبصرے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''اب اس تعارف کے بعد جب ہم شاعر موصوف کے کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف ''سوز و ساز'' کو اقبال سے نسبت دے کر بے چارے پر اس قسم کی تہمت لگائی جارہی ہے جیسا کہ ایک زمانے میں آغا حشر کا شیکسپیئر اور حفیظ جالندھری کا فردوسی سے شجرۂ نسب ملایا جاتا تھا۔ فاروق بانس پوری صاحب کے کلام کو اگر فن اور آرٹ کی جملہ شرائط یا جمالیاتی و تخلیقی عناصر سے ہٹ کر دیکھا جائے تو ان کا کلام اپنی جگہ پر مفید ثابت ہوسکتا ہے لیکن یہ صحیفۂ اخلاق شعر و ادب کے عام طالب علموں کو شاید ہی اپنی طرف متوجہ کرسکے۔ اس لیے نہیں کہ مذہب و اخلاق یا اسلام و تصوف شاعری کا موضوع نہیں بن سکتے بلکہ اس لیے کہ ان نظموں میں اسلام ایک تخلیقی یا فن کارانہ محرک کے طور پر نہیں بلکہ تبلیغی یا واعظانہ محرک کے طور پر سامنے آتا ہے۔''

(ہماری زبان، ص 12، یکم جون 1961)

تقابلی مطالعے کے سلسلے میں عموماً چند بنیادی باتیں فراموش کردی جاتی ہیں۔ دو تخلیق کاروں کے درمیان پائی جانے والی مماثلتیں کچھ مشترک تشبیہات و استعارات ہی نہیں ہوتیں بلکہ ان استعاروں میں پوشیدہ گہری بصیرت اور آگہی کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں تقابلی مطالعے کے نام پر جو چیزیں سامنے آئی ہیں انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ روحیں بھی شرمندہ ہوتی ہوں گی جن کے اوّل درجے کے متن کو کسی کمتر اور کمزور متن کے ساتھ رکھ کر دیکھا گیا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ متن کے ساتھ کوئی جیسا سلوک کرنا چاہے وہ آزاد ہے لیکن متن کسی کو معاف نہیں کرتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تحقیق و تنقید میں ایسی کوئی راہ کیوں اختیار کی جائے جس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔ جو لوگ جان بوجھ کر کھیلا کرتے ہیں ان کی گرفت تو ترجیحات میں شامل ہونی چاہیے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی تقابل اور موازنے کے تعلق سے اس قدر حساس ہیں کہ ایسے مواقع پر ان کا لہجہ سخت ہوجاتا ہے۔ عبدالمجید عدم کے شعری مجموعے ''گلنار'' کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''صرف بادہ و ساغر کی مشابہت سے عدم کو خیام کہنا دونوں کے ساتھ ظلم ہے۔ عدم کی شاعری ہلکی پھلکی غنائی شاعری ہے جس کا سارا لطف جذبات کی گہرائی کے بجائے تشبیہات کے انوکھے پن میں ہے۔ لیکن خیام کو جن لوگوں نے پڑھا ہے انھیں بخوبی معلوم ہے کہ خیام کی شاعری تفکر کی شاعری ہے اور زندگی اور کائنات کے بارے میں اس کے پاس ایک مربوط نقطۂ نظر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عدم کی شاعری خالص نشاطیہ شاعری ہے جبکہ خیام کے یہاں طنز کی تلخی اور مروجہ نظامِ حیات کے خلاف ایک جارحانہ طرزِ عمل ملتا ہے۔ ان سب حقائق کے پیش نظر خیام اور عدم دونوں کو ایک رشتے میں منسلک کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے غالب اور داغ کو ایک صف میں لانا۔''

(ہماری زبان، ص 11، یکم اکتوبر 1957)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے جس سادگی اور صفائی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے وہ ان کے مرتب ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔ عدم کی شاعری ہلکی پھلکی غنائی شاعری

ہے، جذبات کی گہرائی کے بجائے تشبیہات کا انوکھا پن ہے۔ خیام کی شاعری تفکر کی شاعری ہے، ان کے یہاں زندگی اور کائنات کے بارے میں مربوط نقطۂ نظر ہے، عدم کی شاعری خالص عشقیہ ہے خیام کے یہاں طنز کی تلخی اور مروّجہ نظامِ حیات کے خلاف ایک جارحانہ طرزِ عمل ملتا ہے۔ یہ جملے 1957 میں لکھے گئے تھے لیکن آج بھی اپنی معنویت کا احساس دلاتے ہیں۔ ان جملوں کے پیچھے جو فکر ہے وہ کبھی پرانی نہیں ہوگی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے نزدیک خیام اور عدم کو ایک رشتے میں منسلک کرنا ایسا ہی ہے جیسے غالب اور داغ کو ایک صف میں لانا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب اور داغ کو ایک صف میں اگر کھڑا کر دیا جائے تو اس کی کچھ علمی و ادبی بنیادیں ہوسکتی ہیں لیکن خیام کو عدم کے ساتھ لاکھڑا کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے پیش نظر فکری شاعری کے وہ نمونے ہیں جو حیات و کائنات کے تعلق سے گہری بصیرت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ کوئی ہلکی پھلکی جذباتی شاعری حیات و کائنات کے مسائل کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی غنائی شاعری کی اہمیت کے قائل ہیں مگر مسئلہ فکری شاعری سے اس کے تقابل کا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فکری شاعری میں غنائیت نہیں ہوئی۔ اصل میں ان تمام باتوں کا تعلق تخلیق کار کی تخلیقیت پر ہے۔ نذیر بنارسی کے شعری مجموعے ''گنگ و جمن'' پر فراق کی رائے سے خلیل الرحمٰن اعظمی نے اختلاف کیا تھا۔ لیکن مہیش چند نقش کی کتاب ''خرام'' پر فراق کی رائے انھیں اچھی لگتی ہے۔

''ابتدائیہ فراق گورکھپوری نے لکھا ہے۔ لکھتے ہیں خرام بہت خوبصورت لفظ ہے اور اس میں صوتی لحاظ سے ایک غنائیت ہے اور معنوی لحاظ سے وجدان کو متاثر کرنے کی صفت۔ شاعر کی خوش سلیقگی کا یہ نام ضامن ہے۔ یہ ایک فقرہ نقش کے کلام پر اچھی تنقید ہے۔'' (ہماری زبان، ص 12، 15 جنوری 1957)

فراق نے ''خرام'' پر جو رائے دی ہے وہ پوری طرح فراق کے ادبی و تنقیدی مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ فراق نے لفظ ''وجدان'' کا استعمال کیا ہے جس کے بغیر ان کی تنقید کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظر ہر اس مقام پر مرکوز ہوجاتی ہے جسے کسی کتاب کا کلیدی حصہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک مثال سید ضمیر جعفری کی کتاب ''جزیروں کے گیت'' پر ان کا تبصرہ ہے۔

''ضمیر جعفری صاحب نے فوجی ملازمت کے سلسلے میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ ملایا اور ساترا وغیرہ میں گزارا ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ان جزیروں کی ایک مخصوص صنف، ''پنتون'' کو اردو لباس میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ پنتون پنجاب کے ''ماہیا'' اور سرحد کے ''ٹپہ'' سے ملتی جلتی سی چیز ہے۔ جعفری صاحب نے ترجمہ بہت اچھا کیا ہے اور اس طور پر ہماری زبان کے سرمائے میں خوبصورت اضافہ کیا ہے۔ نمونے کے طور پر ایک ''پنتون'' کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

سرد پانی کی بیتاب چادر تلے چھپ کے بیٹھی ہیں یوں کونپلیں دھان کی جیسے ''سیلان گر'' کی حسیں جھیل میں مدتوں کے حسیں راز سوئے ہوئے جیسے جنگل کے نیلم میں پریوں کے دل سہمے سہمے ہوئے کھوئے کھوئے ہوئے جیسے خوابوں میں تارے چمکتے ہوئے جیسے دل میں تمنائیں انسان کی۔''

(ہماری زبان، ص 12، 15 جنوری 1957)

مجھے نہیں معلوم کہ ضمیر جعفری کے اس مجموعے کا مطالعہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے معاصرین اور بعد کے لوگوں نے کیا یا نہیں۔ اس صنف کا نہ کہیں ذکر آتا ہے اور نہ ہی ضمیر جعفری کے ترجمے کا۔ جن علاقوں میں رہ کر ضمیر جعفری نے اس مخصوص صنف کے مزاج سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے یہ خود اپنے آپ میں اہم بات ہے۔ کسی صنف کی تہذیبی فضا میں رچے بسے بغیر اس صنف سے وابستہ متن کا ترجمہ بہتر طور پر نہیں ہوسکتا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جن چار مصرعوں کو مثالاً پیش کیا ہے ان مصرعوں کی شعریت، نغمگی اور امیجری پڑھنے والے کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ لوک گیت کی تہذیبی اور مقامی فضا اس کی بڑی طاقت ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اظہر علی فاروقی کی کتاب ''لوک گیت'' پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

لوک گیتوں کی تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کا احساس دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں کو رہا ہے۔ کسی ملک کے لوک گیت کا مطالعہ کیجیے اس میں عوام کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیں گی اور ان کی دکھ سکھ کی سچی اور بے لوث تصویریں نظر آئیں گی۔ اظہر علی فاروقی صاحب کی یہ مختصر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ (ہماری زبان ص 12، 15 مارچ 1966)

خلیل الرحمٰن اعظمی ہر صنف کے فن پارے کی تحسین کی بنیادیں الگ الگ تلاش کرتے ہیں۔ وہ ہر صنف کے سماجی اور تہذیبی پس منظر اور محرکات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں توازن کا احساس ہوتا ہے۔ شاعری کی عظیم ترین روایت کی آگہی اور وکالت کے باوجود کسی صنف یا ہیئت کی سادگی، سچائی اور عمومی سروکار کا بھی ان کے تنقیدی سروکار میں ایک اہم مقام ہے۔ وہ مختلف ادبی تقاضوں کو خلط ملط نہیں کرتے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقیدی کاٹ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ مشتعل نہیں کرتی۔ ان کے یہاں متن کو قبول یا رد کرنے کا عمل جذباتیت اور جارحیت سے بلند ہے۔ ان کے دو بزرگ معاصر کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور دونوں کے تنقیدی اسلوب کے بہترین عناصر ان کے یہاں ہم آہنگی اور توازن کا احساس دلاتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی کے قطعات کے مجموعے ''سروشِ ہستی'' کے تعارف میں شاد کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں لکھتے ہیں۔

''شاد عظیم آبادی اردو کے ان قابلِ قدر شعرا میں ہیں جنھوں نے اردو غزل کی نجی لے میں ہندی لب و لہجے کا رس شامل کر کے اردو شاعری کو ایک نئی آواز سے آشنا کیا۔ اس البیلے شاعر نے اردو غزل کو جن نئے امکانات سے آشنا کیا ہے اس کا ابھی خاطر خواہ اعتراف نہیں کیا گیا۔''

(ہماری زبان، ص 11، 15 فروری 1957)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے شاد کے قطعات پر اپنی رائے دیتے ہوئے اقبال کو یاد کیا ہے۔ شاد کے قطعات دراصل مسلسل اور لمبی نظم کی مانند ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے کہ "اس مجموعے کی تمام نظمیں انسان اور کائنات کے بارے میں ایک فلسفیانہ سطح سے لکھی گئی ہیں۔" خلیل الرحمٰن اعظمی نے شاد پر اگر چہ کوئی باضابطہ مضمون نہیں لکھا مگر 1957 کے اس تبصرے کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاد کی شاعری پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ انھیں موقع نہیں ملا ورنہ وہ دلائل کے ساتھ یہ بتاتے کہ شاد البیلا شاعر کیوں ہے؟ اور عجمی لے میں ہندی لب ولہجے کا رس کس طرح انھوں نے شامل کیا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے اس تبصرے کو پڑھ کر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ وہ اختصار کے ساتھ شاد کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں لکھ دینا چاہتے ہیں۔ وہ شاد کی ایک طویل نظم "پیروی مغرب" کا حوالہ دیتے ہوئے نظم کے چند مصرعے درج کرتے ہیں۔

ہر ایک چیز کو اس کی جگہ پہ غور کرو
کہ مقتضائے طبیعی ہے اس جگہ کا کیا
ہمارے ان کے مذاقوں میں جس جگہ ہے فرق
تو اس جگہ نہیں تقلید ان کی ہم کو روا

اس کے بعد خلیل الرحمٰن اعظمی رقمطراز ہیں:

"مغرب کی شاعری کے متعلق یہ متوازن رویہ ڈاکٹر عبداللطیف اور کلیم الدین احمد جیسے نقادوں کی توجہ کا مستحق ہے۔"

(ہماری زبان ص 11، 15 فروری 1957)

کلیم الدین احمد نے کلیات شاد تین جلدوں میں مرتب کیا تھا جو 1975 میں بہار اردو اکادمی سے شائع ہوا۔ کلیم الدین احمد نے کلیات شاد کے دیباچے میں شاد کی عجمی لے اور ہندی رس کے امتزاج کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اور شاد کی شاعری کے مقامی عناصر کو اردو غزل کے سیاق میں کم یاب قرار دیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جب یہ تبصرہ لکھا تھا اس کے بعد کلیات شاد طبع ہو کر سامنے آیا۔ انھوں نے شاد کے متوازن رویے کی طرف کلیم الدین احمد کو متوجہ کیا تھا۔ بالآخر خلیل الرحمٰن اعظمی کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین کلیات شاد میں اپنے تنقیدی موقف کے اعتبار سے بہت مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے شاد کی طرف اتنی توجہ کی کہ انھیں دیباچے میں اردو غزل کی تثلیث کا ایک رکن بنا دیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظر سے اگر اس کا یہ دیباچہ گزرتا تو انھیں حیرت بھی ہوتی اور خوشی بھی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی ذہنی تشکیل میں ترقی پسند تحریک کا ایک تاریخی رول رہا ہے۔ وہ بعد میں تحریک کے مقاصد اور اس کی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوگئے۔ ان کی کتاب "ترقی پسند ادبی تحریک" میں ان کی بعض رایوں سے اس خیال کو تقویت ملی۔ لیکن ان کے یہاں زندگی اور کائنات کا ایک روشن پہلو ہمیشہ موجود رہا ہے۔

میں شہید ظلمتِ شب سہی مری خاک تو یہی آرزو
کوئی روشنی، کوئی روشنی، کوئی روشنی، کوئی روشنی

خلیل الرحمٰن اعظمی اگر ترقی پسند تحریک سے ناراض ہوئے تو اس کا ایک ادبی اور تخلیقی جواز ہے۔ لیکن "ہماری زبان" میں ان کے چار تبصرے ایسے ہیں جو ترقی پسند نقطۂ نظر سے متعلق کھلے ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔ "شعر و حکمت" کے ایک شمارے میں مغنی تبسم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"البتہ ایک فقرہ ان کے قلم سے ایسا نکل گیا ہے جو بحث طلب ہے۔" یعنی ترقی پسند تحریک ادب کے رشتے سے ایک بے معنی اصطلاح تھی۔ یہ نام ایک سیاسی سازش کے تحت ادب کے سرمنڈھ دیا گیا تھا۔" ضرورت ہے کہ صاحب مقالہ اس سلسلے میں اپنے خیالات کو ٹھوس دلیلوں کے ساتھ واضح کریں۔"

(ہماری زبان ص 12، یکم جون 1975)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے مغنی تبسم کو رد بھی نہیں کیا لیکن ان کا یہ مطالبہ بجا ہے کہ انھیں اپنی بات ٹھوس دلیلوں سے ثابت کرنی چاہیے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظر سے تحریر کا کوئی اہم حصہ اوجھل نہیں رہ سکتا۔ احتشام حسین کی تنقیدی کتاب "اعتبار نظر" پر ان کا تبصرہ علمی و ادبی دیانت داری کا اہم حوالہ ہے۔

"ان کی تحریروں میں ایک عالمانہ سنجیدگی ہوتی ہے جس کا اعتراف وہ لوگ بھی کرتے ہیں جنھیں عام طور پر ان کے تنقیدی نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں ہے لیکن یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جہاں بھی ان کی شخصیت اور ان کی ادبی کارگزاریاں معرض بحث میں آتی ہیں وہاں انھیں محض نقاد کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو ان کی تنقید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس انداز نظر کے اختیار کرنے کے سبب ان کے بارے میں جو رائیں دی جاتی ہیں ان میں عام طور پر افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ احتشام صاحب کی کئی حیثیتیں ہیں اور اسی اعتبار سے ان کے مضامین اور تحریریں بھی مختلف اور متنوع خصوصیات کی حامل ہیں اور جب تک ان تمام حیثیتوں کو سامنے نہ رکھا جائے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا۔"

(ہماری زبان، ص 12، دسمبر 1965)

خلیل الرحمٰن اعظمی کسی علمی و ادبی شخصیت کے اعتراف میں تکلف سے کام نہیں لیتے وہ دل کھول کر تعریف کرتے ہیں مگر خوبیوں کا ذکر کرنے کے بعد کمیوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر بھی نہیں کرتے۔ احتشام حسین کی کتاب "اعتبار نظر" کی تحسین کے بعد اخیر میں وہ لکھتے ہیں۔

"ان مضامین میں طرز تحریر بھی ایک سا نہیں ہے۔ کہیں بہت ٹھوس اور سنجیدہ بحث ہے کہیں ہلکا پھلکا تاثراتی انداز ہے۔ کہیں عالمانہ نثر ہے تو کہیں انشائیہ کی سی کیفیت ہے۔ اس مجموعے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ احتشام

صاحب نقاد محض نہیں ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک ادیب ہیں اور انھیں ادب اور زندگی کے متنوع پہلوؤں سے دلچسپی ہے۔''

(''ہماری زبان'' ص 11، 22 دسمبر 1965)

''ہماری زبان'' میں فیض کے تعلق سے خلیل الرحمٰن اعظمی کے دو تبصرے شائع ہوئے۔ ایک کلیات فیض ''حرف حرف'' پر۔ (اس وقت کے تمام مجموعے ''حرف حرف'' میں شامل تھے) دوسرا، رسالہ ''افکار'' کے فیض نمبر پر انھوں نے فیض کی جو شعری خوبیاں بیان کی ہیں ان سے واضح ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظر میں فیض اس لیے اچھے شاعر نہیں کہ وہ ترقی پسند ہیں بلکہ ان کی ہنرمندی انھیں اہم بناتی ہے۔ ''ہنرمندی'' ایک ایسا لفظ ہے جس کی تنقید میں طرح طرح سے تفسیر کی جاتی رہی ہے۔ ایک ہنرمندی ناسخ کی ہے تو دوسری انیس کی۔ لہٰذا یہ اہم سوال ہے کہ جب ہم کسی شاعر کی ہنرمندی کا ذکر کر رہے ہیں تو اس کا تعلق بے کیف فنی دسترس سے ہے یا با کیف فنی دسترس سے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظر میں فیض کی داخلی دنیا بھی اہم ہے۔ سوال یہ ہے کہ فیض کے یہاں ایسی دل آسائی، غنائیت اور حلاوت کہاں سے آئی۔ وہ کون سی شے ہے جو چپکے سے ہمیں اور ہمارے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں زنداں کے تلازمات سے بحث کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ استعارے کلاسیکی ضرور ہیں مگر بہادر شاہ ظفر نے انھیں اپنے تجربے کا حصہ بنا کر ان میں نئی زندگی کا خون دوڑا دیا ہے۔ کوئی لفظ پرست نقاد ظفر کے شعری استعارے کو اس نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ فیض کے تعلق سے خلیل الرحمٰن اعظمی کے خیالات ادبی اصولوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مجموعی اعتبار سے خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں زندگی کے تجربات و احساسات کی اہمیت ہے۔

''ان کی غنائی شاعری کو تب و تاب ملی ہے ان کے اس اسلوب بیان سے جس میں روایت اور جدیدیت کا عجیب و غریب امتزاج شامل ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں مشرق اور مغرب کی شعری موسیقی کو ملا کر ایک ایسا آہنگ پیش کیا ہے جو ہمارے حواس کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فیض دور حاضر کے ان معدودے چند شعرا میں سے ہیں جن کے کلام کا جادو ان قارئین پر بھی چلتا ہے جو شاعر کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں رکھتے۔''

(ہماری زبان ص 12، یکم دسمبر 1966)

''افکار'' کے فیض نمبر کے جن مضامین کی خلیل الرحمٰن اعظمی نے تعریف کی ہے ان میں آل احمد سرور، ممتاز حسین، مسعود حسین خاں، احتشام حسین اور سلامت اللہ کے مضامین شامل ہیں۔ تمام مضامین ایسے نہیں ہیں کہ انھیں خالص ادبی تنقید کا نام دیا جاسکے۔ تمام مقالہ نگاروں کی نظر بار بار فیض کی سیاسی وابستگی کی طرف جاتی ہے کوئی تحریک کسی کو اچھا شاعر نہیں بناتی مگر اس کے اندر زندگی اور کائنات کے تعلق سے ایک ذمے داری کا احساس ضرور جگاتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ادب کو ادب سمجھ کر پڑھنے پر زور دیتے ہیں مگر وہ ادب اور سماج کے درمیان کوئی دیوار اٹھانا نہیں چاہتے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ادب میں تجربے کے حامی تھے۔ انھوں نے نئے شعرا و ادبا کی بعض کوتاہیوں کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کرلیا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ کسی عبوری دور میں تخلیق کاروں سے ایسے ادب کا مطالبہ کرنا جو ہر لحاظ سے مکمل ہو مناسب نہیں۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے کئی تبصروں میں اپنے موقف کا اعادہ کیا ہے۔ خلش بڑودوی کے شعری مجموعے ''قطار تیشہ'' پر انھوں نے یہ رائے دی ہے:

''ذاتی طور پر تکنیک اور نئے آہنگ کو پسند کرنے کے باوجود خلش صاحب کو اس بات پر مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ جدید تر شاعری کے عذاب میں مبتلا نہیں ہوئے بڑی دلچسپ بات معلوم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کہ اس عذاب میں مبتلا ہوئے بغیر نئے آہنگ اور نئی ترنگ تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ نئی تکنیک اور نئے آہنگ کی جستجو میں لغزشیں بھی ہوتی ہیں اور روایتی ڈگر سے الگ چلنے میں کچھ خطرات بھی مول لینے پڑتے ہیں۔ لیکن اس کے بغیر کوئی شاعر اپنے انفرادی طرز کو دریافت نہیں کرسکتا۔''

(ہماری زبان ص 12، 15 جولائی 1970)

اس مجموعے کا تعارف علی سردار جعفری نے لکھا تھا۔ جعفری ایک طرف خلش کی شاعری کو جدید تر شاعری کے عذاب سے محفوظ بتاتے ہیں اور دوسری طرف ان کے لیے لغزشِ مستانہ کی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جعفری کی اس کشمکش کی گرفت کی ہے۔ لغزشِ مستانہ جدید شاعری کے عذاب سے بھلا کس طرح خود کو بچا سکتی ہے۔ نئی شاعری کے خام تجربوں اور کوششوں کی تحسین کا خلیل الرحمٰن اعظمی نے جو پہلو نکالا ہے اسے کشادہ ذہنی کا نام دینا چاہیے۔

(ہماری زبان ص 12، 15 جون 1970)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے شعری مجموعوں کے مطالعے میں انفرادیت پر خاصا زور دیا ہے۔ جن شعرا کے یہاں کلاسیکی روایات کا گہرا اثر ہے ان سے وہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتے کہ کلی طور پر اپنا رنگ تبدیل کردیں۔ اس رنگ میں بھی یادگار اشعار کہے جاسکتے ہیں۔ دوسری طرف خلیل الرحمٰن اعظمی ان شاعروں کی قدر افزائی کرتے ہیں جنھوں نے فکر و اظہار کی سطح پر بغاوت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ بغاوت کے لیے کلاسکس کی واقفیت کو لازمی تصور کرتے ہیں۔ کئی مقامات پر وہ نئے شعرا کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ کلاسیکی شاعری کے مطالعے سے ہی انفرادیت کا کوئی بامعنی راستہ نکل سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی پسند کے جن اشعار کو تبصروں میں بطور حوالہ پیش کیا ہے اگر ان کو یکجا کرکے پڑھیے تو خلیل الرحمٰن اعظمی کے ادبی ذوق اور ادبی دیانت دونوں کا احساس ہوگا۔ یہ اشعار آج بھی ہمیں تازہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن نے اپنے عہد کی کتابوں خصوصاً شعری مجموعوں کی قرأت میں جس ذمے داری کا ثبوت پیش کیا ہے وہ اس زمانے میں تقریباً ناپید ہے۔ □□□

پتہ:
Urdu Deptt., Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar, N.Delhi-25

اردو کے مشہور اور مستند شاعر اور نقاد **خلیل الرحمٰن اعظمی** کی اہم کتابیں جو ایک عرصے سے نایاب تھیں، قومی اردو کونسل نے خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کی ہیں۔ ہر اچھی اردو لائبریری میں ان کتابوں کی موجودگی ضروری ہے

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

اپنے وقت کی سب سے اہم ادبی تحریک کا بھرپور تعارف جو ترقی پسند تحریک کے نام سے 1935 میں شروع ہوئی اور پندرہ سے بیس سال کی مدت میں جس نے ادیبوں اور شاعروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ اس تحریک کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے غیر جانبداری کے ساتھ تحریک کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور تحریک سے وابستہ اہم قلمکاروں کے فکر و فن پر بھی گفتگو کی ہے۔

صفحات: 410، سائز ڈیمائی، قیمت: -/241 روپے

مقدمہ کلام آتش

خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری پر یہ مبسوط مقالہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے 1948 میں، جب وہ بی. اے. کے طالب علم تھے، تحریر کیا تھا۔ جب یہ مقالہ بالاقساط ''نگار'' میں شائع ہوا تو نیاز فتح پوری نے اسے اپنے ادارتی نوٹ میں سراہتے ہوئے لکھا کہ ''جناب اعظمی جس دقتِ نگاہ اور امعانِ نظر سے کام لے رہے ہیں، وہ آتش کے باب میں اس وقت تک کسی بھی صاحب قلم کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی۔'' بابائے اردو مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبداللہ، وحید قریشی اور دیگر کئی اکابر نے بھی اس مقالے پر اپنی بھرپور پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

صفحات: 134، سائز ڈیمائی، قیمت: -/139 روپے

زاویۂ نگاہ

یہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے نو تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں پانچ مضامین پانچ اہم شخصیتوں سرسید، ابوالکلام آزاد، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور اختر الایمان کے حوالے سے ہیں۔ ایک مضمون میں ''اردو تنقید کے مسائل'' پر گفتگو ہے اور ایک مضمون کا عنوان ہے ''اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ'' باقی دو مضامین ہیں: ''اردو شعر و ادب میں علی گڑھ کا حصہ'' اور ''دو نئے شعری مجموعے''۔

صفحات: 184، سائز ڈیمائی، قیمت: -/138 روپے

فکر و فن

خلیل الرحمٰن اعظمی مروجہ تنقیدی اصولوں اور نظریات کی پابندی کو ناگزیر نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ادب کا براہ راست مطالعہ کر کے ادب کی خصوصیت کو سمجھنے اور اس کا معیار متعین کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کتاب میں ان کے دس مضامین شامل ہیں جو بالترتیب، غالب، ظفر، خواجہ میر درد، حسرت، داغ، مومن، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، مجاز اور جذبی کے فکر و فن کے محاسبے پر مبنی ہیں۔

صفحات: 205، سائز ڈیمائی، قیمت: -/151 روپے

مضامین نو

یہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضامین کا آخری مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں مرتب کیا۔ اس میں شخصیتوں پر بھی مضامین ہیں، عصری ادبی صورت حال کا بھی ذکر ہے، کچھ مسائل پر اظہار خیال ہے اور کچھ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ تبصرے انھی کتابوں پر ہیں جن کی اشاعت کے بعد ادبی منظرنامے میں کچھ چہل پہل نظر آئی اور مسائل بھی وہی اٹھائے گئے ہیں جو اہم تھے اور اہل نظر کی توجہ کے طلب گار۔

صفحات: 240، سائز ڈیمائی، قیمت: -/172 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

نشاط فاطمہ

ذکرِ بُتاں اور فکرِ جہاں کا شاعر: وامق جونپوری

ترقی پسند شاعری کے دورِ عروج میں شہرت حاصل کرنے والے شاعر وامق جونپوری، جونپور کے ایک موضع کجگاؤں میں 23 اکتوبر 1909 کو پیدا ہوئے۔ احمد مجتبیٰ نام رکھا گیا۔ والد کا نام محمد مصطفیٰ تھا۔ گھر کا ماحول ادبی تھا اس لیے کہ وامق کے دادا مجتبیٰ حسین عربی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ وامق نے ایل۔ایل۔بی کرنے کے بعد وکالت سے زیادہ شاعری میں دلچسپی لی۔ جس کی بنا پر وکالت ترک کردی۔ کچھ عرصے کے لیے سرکاری نوکری کرلی۔ پھر وہ بھی چھوڑ دی۔ وامق کے کلام کے تین مجموعے ''چیخیں''، ''جرس'' اور ''شب چراغ'' شائع ہوئے۔ لیکن شعری مجموعوں کی اشاعت سے پہلے ہی وامق بحیثیت شاعر مقبول ہو چکے تھے۔

وامق کو بچپن ہی سے شاعری سے دلچسپی تھی۔ ابتدائی دور میں رومانی نظمیں اور غزلیں ان کی شہرت کا باعث بنیں۔ ان کے ترنم، میں ایک خاص کیفیت تھی جو اسے لحن داؤدی میں بدل دیتی تھی۔ اس دور میں ان کے بعض شعر بہت مقبول ہوئے، جیسے:

غمِ دوراں کو گوارا جو بنا دے، اُسے کیا
اور بھی کچھ، تیرے وعدوں کے سوا کہتے ہیں
شعر ذکرِ بتاں، شعر فکرِ جہاں، شعرِ عطرِ زباں
شعر ہے اِک فسوں، کیا خرد، کیا جنوں، اُس کے زیرِ اثر
کبھی کتاب، کبھی انقلاب لائے ہیں
بدل بدل کے سبو، ہم شراب لائے ہیں
دیارِ شوق نگاہوں سے دو قدم بھی نہیں
مگر یہ فاصلۂ چند گام کم بھی نہیں

پہلی عالمی جنگ کے بعد پیدا ہونے والے حالات نے ملک کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح نوجوان شاعر وامق کو بھی متاثر کیا۔ انھوں نے ان حالات کی شدت کو محسوس کیا اور اپنے اس کرب و اضطراب کو شعر کے قالب میں ڈھالنے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں دور رس تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ 1917 کے روسی انقلاب کی گونج ہر جگہ سنائی دے رہی تھی اور ادھر آزادی کی لڑائی ملک میں تیز تر ہونے لگی تھی۔ اسی دوران 1936 میں ترقی پسند ادبی تحریک نے اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کے لیے ایک پلیٹ فارم دیا۔ سید سجاد ظہیر کی سربراہی میں یہ تحریک تیزی سے آگے بڑھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر نوجواں شاعر اور ادیب ترقی پسند نظریات کا مُبلّغ بن کر سامنے آنے لگا۔

وامق بھی اس سے متاثر ہوئے اور اس کے زیر اثر ہی انھوں نے ''ذکرِ بتاں'' کے ساتھ ''فکرِ جہاں'' کو اپنی شاعری کا عنوان بنایا۔ سماج اور معاشرے کے اہم مسائل کو اپنی شاعری میں ڈھالنا شروع کیا۔

1947 میں ملک آزاد ہو گیا لیکن آزادی کے ساتھ ملک کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔ تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے جاں گسل اور روح فرسا واقعات پر ادیبوں اور شاعروں کا تڑپ اٹھنا ناگزیر تھا۔ نظم و نثر دونوں میں بہت کچھ لکھا گیا۔ نثر میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، منٹو، بیدی، عصمت اور قرۃ العین حیدر تو نظم میں سردار جعفری، فیض، مخدوم، ساحر، مجاز، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کے ساتھ وامق نے بھی انسانیت سوز واقعات کے دلدوز مناظر پیش کیے۔ وامق کی نظم ''تقسیم پنجاب'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہٹ گئے ہوش کے محور سے، تمدن کے قدم
یومِ آزادی کا ہر لمحہ جھکائے ہوئے سر
دادخواہی کے لیے پھر سوءِ مغرب ہے رواں
جل رہی ہے سرِ بازار چتا غیرت کی
بربریت کے ہوس خانے ہوئے پھر آباد
پھر اُٹھالے گیا سیتا کو، کوئی راون آج

اور ''بھوکا بنگال'' جیسی نظم جو وامق کی مقبول ترین نظموں میں سے ایک ہے:

پورب دیس میں ڈُگی باجی، پھیلا سکھ کا جال
دُکھ کی اَگنی کون بجھائے، سوکھ گئے سب تال
جن ہاتھوں نے موتی رولے، آج وہی کنگال رے ساتھی
آج وہی کنگال

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال

وامق کی نظم ''کوریا'' کو بھی بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

کسی کے گھر میں کود کر، مُحافظت فریب ہے
یہ شانِ جارحانہ، صرف ڈاکوؤں کو زیب ہے
فراز، اُس کو کیا کہیں، جو اصل میں نشیب ہے
اندھیرا ہی اندھیرا ہے یہ رنگِ خاوری نہیں
عوام امن مانگتے ہیں، جنگِ آمری نہیں

وامق کے یہاں انقلاب کی اس لہر کے ساتھ رومانیت کی لہر بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ کیونکہ شاعری کو وامق نے ''ذکرِ بتاں اور فکرِ جہاں، دونوں سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وقت کے ساتھ اُن کا رومانی لہجہ تجربات کی آنچ

میں تپ کر کچھ سنولا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک پر وہ وقت بھی آیا جب اس کی صفوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ کمیونسٹ پارٹی نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ ادبی اور تہذیبی محاذ پر بھی واضح طور پر خطِ فاصل کھینچ دیا جائے: آنگل کے میداں میں دو رُخی کے خانے سے۔ کہا گیا کہ مبہم انداز بیان، استعاروں اور علامتوں کے ذریعے سے اظہار خیال وقت کا تقاضا نہیں ہے کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے پنڈت نہرو کی ناوابستگی کی پالیسی کو بھی رد کیا گیا۔ سردار جعفری اس گروہ کے سرخیل تھے انھوں نے فیض پر بھی اعتراض کیا کہ ''یہ شب گزیدہ سحر'' کیا ہے۔ صاف کہیے کہ آزادی جھوٹی ہے۔ انھوں نے کیفی اعظمی کی شاعری کو مثالی ترقی پسندی شاعری قرار دیا۔ وامق صاحب نے اُس وقت سردار جعفری سے ''شاہراہ'' کے صفحات پر ادبی مناظرہ کیا تھا انھوں نے براہ راست لہجے میں کی جانے والی شاعری کو کمزور شاعری قرار دیا۔ سردار جعفری نے درج ذیل مصرعوں کو مثالی شاعری مانتے ہوئے مثال میں پیش کیا

جُروا چھکے اُجری مُجریا
رَن چھکے خَروار
سبھا میں مورے سَیّاں کی پگڑی
مُٹھیا پہ بندِ یا ہمار

وامق نے عوامی لب و لہجے میں انقلابی شاعری کے نمونے کے طور پر اپنی مشہور نظم ''بھُجریا'' پیش کی:

کیسے کھیلن جیہو ساون میں کجریا
بدریا گھِر آئی گوریا
سنگ اچھک لے میں ہتری ڈگریا
کجریا، کیسے کھیلن جیہو کجریا

دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں کا حوالہ دیتے ہوئے روسی بلاک کی طرف سے امن کا نعرہ دیا گیا تو اردو شاعروں نے بھی اس نعرے کی ہمنوائی کی۔ وامق کی نظم ''نیلا پرچم'' اسی دور کی یادگار ہے:

ہم امن اس لیے چاہتے ہیں
ہم اپنی تہذیب کے ہیں عاشق
ہمارا فن ہم کو دل سے پیارا ہے
ہم امن اس لیے چاہتے ہیں
کہ آج آزادیوں کا بڑھتا ہوا سفینہ رُکے نہ پل بھر کو
بھنور میں پھنس کے نہ ڈوب جائے، یہ نیلا پرچم نہ جھکنے پائے

وامق کی یادگار نظموں میں ''مینا بازار'' وقت، اور فن، جیسی نظمیں شامل ہیں۔ ''مینا بازار'' تو ان کی پہچان بن گئی تھی ہر محفل اور ہر مشاعرے میں اس کی فرمائش ہوتی۔ اصل میں وامق کے الفاظ میں ہی نہیں آواز میں بھی جادو تھا جس سے سامعین مسحور ہو جاتے تھے:

مناروں پر اذاں ہوئی
یہ شام بھی کہاں ہوئی
پجاری مندروں میں آکے سنکھ پھونکنے لگے
گجر بجا — جن دبے
وہ قہقہے چہک اٹھے
دکانیں جگمگا گئیں
نگاہوں میں سما گئیں
وہ مہوشانِ سیم بر، فسوں طرازِ رہ گزر، ذروں پہ اپنے آگئیں
اور اپنی کائنات غم پہ خود ہی جیسے چھا گئیں
زمانے کے سلوک سے
یہ تنگ آکے بھوک سے
رگڑ رہی ہیں ایڑیاں
ذلتوں کے غار میں
اور، انتقام کے لیے
کھڑی ہیں انتظار میں
یہ وہ ہیں جن کے گھر، بلندیوں پہ رہ کے پست ہیں
یہ وہ ہیں جن کی ہر فتح، شکست ہی شکست ہے

نظم ''وقت'' میں وقت کی اہمیت کو پیش کیا گیا ہے۔ وقت جو دیدہ ور بھی ہے اور صورت گر بھی یونان و مصر و روما کی تہذیبوں کو وقت ہی نے پروان چڑھایا اور فنا کیا۔ اجنتا، ایلورا، مسجدِ قرطبہ اور تاج محل کا معمار بھی وقت ہی ہے اور آج وہ بھی وقت کی زد پر ہیں۔ وقت ہر شے پر محیط ہے۔ جو وقت کی قدر کرے گا وقت اس کی قدر کرے گا۔

نظم ''فن'' میں وامق فن کو انسانی زندگی کی جان قرار دیتے ہیں۔ فن ہی انسان کو سنوارتا، نکھارتا ہے۔ ارتقا کی منزلیں سر کراتا ہے۔ وہی گپھاؤں میں پیکر تراشتا ہے اور وہی کھلی جگہ میں تاج محل، بنتا ہے۔ فن کی انگلیاں ہمیشہ زندگی کی نبض پر رہتی ہیں۔ دنیا کتنی ہی بدل جائے۔ فن کی اہمیت اپنی جگہ پر بنی رہے گی۔

وامق صاحب کے کلام میں موضوع اور طرز ادا کی ہم آہنگی ان کو اردو شعرا میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ وہ ایک سچے فنکار تھے اسی لیے ان کے فن میں کشش ہے۔

□□□

پتہ:
2/C, Abubakarpur,
Dhoomanganj,
Allahabad

ڈپٹی نذیر احمد

حُسن آرا کی بدمزاجی اور شرارت

حُسن آرا کے مزاج کی اُفتاد ایسی بُری پڑی تھی کہ اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا۔ نہ ماں کا ادب نہ آپا کا لحاظ، نہ باپ کا ڈر، نہ بھائیوں سے ملاپ، نوکر ہیں کہ آپ نالاں ہیں، لونڈیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں، غرض حُسن آرا سارے گھر کو سر پر اٹھائے رہتی تھی۔ شاہ زمانی بیگم کے آنے سے چاہیے تھا کہ بڑی خالہ سمجھ کر حسن آرا گھڑی دو گھڑی کو چپ ہو کر بیٹھ جاتی، کیا ذکر شاہ زمانی بیگم کو پالکی سے اترے دیر نہ ہوئی تھی کہ لگاتار دو تین فریادیں آئیں۔ نرگس روتی ہوئی آئی کہ بیگم صاحب دیکھیے چھوٹی صاحبزادی نے اس زور سے پتھر مارا کہ میری آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچ گئی۔ سوسن نے آ فریاد کی کہ بیگم صاحب چھوٹی صاحب نے مجھ سے کہا دیکھوں سوسن تیری زبان۔ جوں ہی میں نے دکھانے کو زبان نکالی نیچے سے تھوڑی میں ایسا ٹھکا مارا کہ سارے دانت زبان میں بیٹھ گئے۔ گلاب بلبلا اُٹھی کہ ہائے میرا کان خونا خون ہو گیا۔ دائی چلائی کہ دیکھیے میری لڑکی کمبخت کے ایسے زور سے لکڑی ماری کہ بازو میں بدھی پڑ گئی۔ باورچی خانے سے ماما نے دہائی دی کہ اجی کوئی ان کو سمجھاتا۔ سالن کی پتیلیوں میں مٹھیاں بھر بھر کر راکھ جھونک رہی ہیں۔ شاہ زمانی بیگم نے آواز دی کہ حسنا یہاں آؤ۔ خالہ کی آواز پہچان بارے حسن آرا چلی تو آئی، نہ سلام نہ دعا، ہاتھوں میں راکھ، پاؤں میں کیچڑ اُسی حالت میں دوڑ خالہ سے لپٹ گئی۔

خالہ نے کہا کہ حسنا تم بہت شوخی کرنے لگی ہو۔

حسن آرا نے کہا اس سنبل چڑیل نے فریاد کی ہوگی۔ یہ کہہ کر خالہ کی گود سے نکل لپک کر بے خطا بے قصور سنبل کا سر کھسوٹ لیا۔ بہتیرا خالہ ایں ایں کرتی رہیں ایک نہ سنی۔

تب تو شاہ زمانی بیگم اپنی بہن کی طرف مخاطب ہو کر بولی، ''بوا سلطانہ اس لڑکی کے لیے تو از برائے خدا کوئی اُستانی رکھو۔''

سلطانہ بیگم نے کہا، ''باجی اما کیا کروں۔ مہینوں سے اُستانی کی تلاش میں ہوں، کہیں نہیں ملتی۔''

شاہ زمانی بیگم بولی، ''اوئی بوا، تمھاری بھی وہی کہاوت ہوئی ڈھنڈورا شہر میں لڑکا بغل میں۔ خود تمھارے محلے میں مولوی محمد فاضل کی چھوٹی بہو لاکھ اُستانیوں کی ایک اُستانی ہے۔''

سلطانہ نے کہا، ''مجھ کو آج تک اطلاع نہیں، دیکھو میں ابھی آدمی بھیجتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اپنے گھر کی داروغہ کو بلایا کہ مانی جی کوئی مولوی صاحب اس محلے میں رہتے ہیں۔ باجی اما کہتی ہیں، ان کی چھوٹی بہو بہت پڑھی لکھی ہیں۔ دیکھو اگر اُستانی گری کی نوکری کریں تو اُن کو لوا لاؤ۔ کھانا کپڑا دس روپے پان زردے کا خرچ ہم دینے کو حاضر ہیں اور جب لڑکی پہلا سپارہ ختم کرے گی اور ادب قاعدہ سیکھ جائے گی تو تنخواہ کے علاوہ بھی انشاء اللہ ہم اُستانی جی کو خوش کر دیں گے۔''

مانی جی مولوی صاحب کے گھر آئیں۔ محمد کامل کی ماں سے صاحب سلامت ہوئی اور پوچھا، ''اچھی بی مولوی صاحب کی بی بی تم ہی ہو۔''

ماما دیانت: ہاں یہی ہیں، آؤ بیٹھو۔ کہاں سے آئیں۔

مانی جی: (گھر والی بیوی کی طرف مخاطب ہو کر) تمھاری چھوٹی بہو کہاں ہیں۔

محمد کامل کی ماں، کوٹھے پر ہیں۔

مانی جی: میں اُن کے پاس اوپر جاؤں۔

دیانت: آپ اپنا پتا نشان بتائیے۔ بہو صاحب یہیں آجائیں گی۔

مانی جی: میں حکیم صاحب کے گھر سے آئی ہوں۔

یہ سن کر محمد کامل کی ماں نے نام بنام سب چھوٹے بڑوں کی خیر و عافیت پوچھی اور مانی سے کہا، ''تمیزدار بہو سے کیا کام ہے۔''

مانی جی: وہی آئیں تو کہوں۔

تمیزدار کے نیچے اترنے کا وقت بھی آ گیا تھا کیوں کہ عصر کی نماز پڑھ کر اصغری نیچے اتر آتی تھی اور مغرب اور عشا دونوں نمازیں نیچے پڑھا کرتی تھی۔ اصغری کو مانی جی نے دیکھا تو اُستانی گری کی نوکری کے واسطے کہتے ہوئے تامل کیا۔ باتوں ہی باتوں میں یہ کہا کہ ''بیگم صاحب کو اپنی چھوٹی لڑکی کا تعلیم کرانا منظور ہے۔ بڑی بیگم صاحب نے آپ کا ذکر کیا تو بیگم صاحب نے مجھ کو بھیجا۔''

اصغری نے کہا، ''دونوں بیگم صاحبوں کو میری طرف سے بہت بہت سلام کہنا اور یہ کہنا کہ جو کچھ برا بھلا مجھ کو آتا ہے، کسی سے مجھ کو عذر نہیں ہے۔ اسی واسطے انسان پڑھتا لکھتا ہے کہ دوسرے کو فائدہ پہنچائے اور بڑی بیگم صاحب کو معلوم ہوگا کہ میں اپنے میکے میں کتنی لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اور میرا جی بہت چاہتا ہے کہ بیگم صاحب کی لڑکی کو پڑھاؤں لیکن کیا کروں نہ تو بیگم صاحب لڑکی کو یہاں بھیجیں گی اور نہ میرا جانا ہو سکتا ہے۔''

مانی جی نے تنخواہ کا نام صاف تو نہ لیا لیکن دبی زبان سے کہا کہ ''بیگم صاحب ہر طرح سے خرچ پات کی ذمے داری بھی کرنے کو موجود ہیں۔''

اصغری نے کہا، ''یہ سب اُن کی مہربانی ہے۔ ان کی ریاست کو یہی بات

زیبا ہے لیکن ان کے زیر سایہ ہم غریب بھی پڑے ہیں تو خدا ننگا بھوکا نہیں رکھتا۔ بے داموں کی لونڈی بن کر تو خدمت کرنے کو میں حاضر ہوں اور اگر تنخواہ دار اُستانی درکار ہو تو شہر میں بہت ملیں گی۔"

اس کے بعد مانی جی نے اصغری کا حال پوچھا اور جب یہ سنا کہ یہ تحصیل دار کی بیٹی ہے اور مولوی محمد فاضل صاحب بھی پچاس روپے ماہواری کے نوکر ہیں تو مانی جی کو ندامت ہوئی کہ نوکری کا اشارہ ناحق کیا۔ مانی ہر چند نوابی کارخانے دیکھے ہوئے تھی لیکن اصغری کی شستہ تقریر سن کر دنگ ہوگئی اور معذرت کی کہ "بی مجھ کو معاف کرنا۔"

اصغری نے کہا، "کیوں تم مجھ کو کانٹوں میں گھسیٹتی ہو۔ اوّل تو نوکری کچھ گناہ نہیں اور پھر ناواقفیت کے سبب اگر تم نے پوچھا تو کیا مضائقہ۔"

غرض مانی جی رخصت ہوئیں اور وہاں جا کر کہا کہ "بیگم صاحب اُستانی تو واقع میں لاکھ اُستانیوں کی ایک اُستانی ہے جس کی صورت دیکھنے سے آدمی بن جائے۔ پاس بیٹھنے سے انسانیت حاصل کرے۔ سایہ پڑ جانے سے سلیقہ سیکھے۔ ہوا لگ جانے سے ادب پکڑے لیکن نوکری کرنے والی نہیں۔ تحصیل دار کی بیٹی ہے۔ رئیس لاہور کے مختار کی بہو۔ گھر میں ماما نوکر ہے۔ دالان میں چاندنی بچھی ہے، سوزنی کا ڈنکیہ لگا ہے۔ اچھی خوش گزران زندگی، بھلا ان کو نوکری کی کیا پروا ہے۔"

شاہ زمانی: سچ ہے بوا سلطانہ تم نے مانی جی کو بھیجا تو تھا۔ لیکن مجھ کو یقین نہ تھا کہ وہ نوکری کریں گی۔

مانی جی: لیکن وہ تو ایسی اچھی آدمی ہیں کہ مفت پڑھانے کو خوشی سے راضی ہیں۔

سلطانہ: یہاں آکر؟

مانی جی: بھلا بیگم صاحب جو نوکری کی پروا نہیں رکھتا ہو یہاں کیوں آنے لگا۔

سلطانہ: کیا پھر لڑکی وہاں جایا کرے گی؟

شاہ زمانی: اس میں کیا قباحت ہے۔ دو قدم پر تو گھر ہے اور مولوی صاحب کو کیا تم نے ایسا بے عزت سمجھا، بھائی علی نقی خاں کی سگی پھوپی زاد بہن کے بیٹے ہیں۔

سلطانہ: آہا تو ایک حساب سے ہماری برادری ہیں۔

شاہ زمانی: لو خدا نہ کرے کچھ ایسے ویسے ہیں۔ پہلے ان کا کام خوب بنا ہوا تھا۔ جب سے رئیس بگڑا بچارے غریب ہوگئے ہیں پھر بھی ماما ہمیشہ رہی۔ ڈیوڑھی پر بھی ایک دو آدمی ہمیشہ رہتے ہیں۔

سلطانہ: خیر حسن آرا وہیں چلی جایا کرے گی۔

اگلے دن شاہ زمانی بیگم اور سلطانہ بیگم دونوں بہنیں حسن آرا کو لے کر اصغری کے گھر آئیں۔ باوجود یکہ اصغری کے یہاں غریبانہ سامان تھا۔ لیکن اس کے انتظام اور سلیقے کے سبب بیگموں کی وہ مدارات ہوئی کہ ہر طرح کی چیز وہیں بیٹھے بیٹھے موجود ہوگئی۔ دو چار طرح کا عطر، چوگھڑا الائچی، چکنی ڈلی، چائے، بات کی بات میں سب موجود ہوگیا۔ خوب خوب مزے کی گلوریاں تیار ہوگئیں۔

دونوں نے اصغری سے کہا کہ، "مہربانی کر کے ذرا اس لڑکی کو دل سے پڑھا دیجیے۔"

اصغری نے کہا کہ، "اوّل تو خود مجھ کو کیا آتا ہے مگر جو دو چار حرف بزرگوں کی عنایت سے آتے ہیں، انشاء اللہ ان کے بتانے میں اپنے مقدور بھر دریغ نہ کروں گی۔"

چلتے ہوئے سلطانہ بیگم ایک اشرفی اصغری کو دینے لگیں۔

اصغری نے کہا کہ، "اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ بھلا یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ میں پڑھوائی آپ سے لوں۔"

سلطانہ بیگم نے کہا، "استغفر اللہ! پڑھوائی دینے کے واسطے ہمارا کیا منھ ہے۔ بسم اللہ کی مٹھائی ہے۔"

اصغری نے کہا، "شروع میں تبرک کے واسطے مٹھائی بانٹ دیا کرتے ہیں۔ سو اشرفی کیا ہوگی۔ بچوں کا منھ میٹھا کرنے کو سیر آدھ سیر مٹھائی کافی ہے۔ یہ کہہ کر دیانت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کوٹھری میں سے ایک قعب بھر کر ٹکتیاں نکال لائی۔ اصغری نے خود فاتحہ پڑھ کر پہلے حسن آرا کو دی اور بھری قعب دیانت کو اٹھا دی کہ سب بچوں کو بانٹ دو۔"

سلطانہ نے کہا، "اچھا تم نے مجھ کو شرمندہ کیا۔"

اصغری نے کہا، "ہم بے چارے غریب کس لائق ہیں۔ یہاں جو کچھ ہے وہ بھی آپ ہی کا ہے۔ البتہ میرا دینا یہی ہے کہ حسن آرا کو پڑھا دوں۔ سو خدا وہ دن کرے کہ میں آپ سے سرخرو ہوں۔"

غرض دنیا سازی کی باتیں ہو ہوا کر شاہ زمانی بیگم چلی گئیں اور حسن آرا کو اصغری کے حوالے کر گئیں۔

حُسن آرا کا مکتب میں بیٹھنا اور لونڈیوں کی بیجا خوشامد

یوں دیکھنے اور کہنے کو تو حسن آرا اکیلی مکتب میں بیٹھی مگر کوئی درجن بھر تو لونڈیاں اس کے ساتھ تھیں اور کوئی کوڑی بھر سہیلیاں۔ لونڈیوں کا تو یہ قاعدہ تھا کہ بے ضرورت بھی ہر دم اور ہر لحظہ چاروں طرف سے حسن آرا کو گھیرے رہتیں اور کچھ کام نہیں تو بات بات میں خوشامد، بات بات پر تعریف۔ ذرا بیٹھک بدلی کہ سب بول اٹھیں۔ بسم اللہ بسم اللہ۔ چھینک لی تو سب چلائیں شکر الحمد للہ۔ مانی جی ہیں کہ چپکے ہی چپکے قل ہو اللہ کی تسبیحیاں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی ہیں۔ لتا ہیں کہ بار بار ان پکا دوم (1) کرتی جاتی ہیں اور جو کہیں حسن آرا نے آنکھ اٹھا

کر دیکھا تو کوئی جلدی جلدی پنکھا جھلنے لگی۔ کوئی چوری یا رومال ہلانے کھڑی ہوگئی۔ کوئی بولی، واری جاؤں گلوری کھالو یا گوٹے ہی کے دو دانے ڈال لو۔ دیر ہوئی منھ بدمزہ ہوگیا ہوگا۔ کوئی کہنے لگی "صدقے گئی، ایک گھونٹ شربت پی لو، نگوڑے ہونٹ ہیں کہ سوکھے جاتے ہیں۔ پڑیاں بندھ گئی ہیں۔ بھاڑ میں جائے ایسا پڑھنا اور آگ لگے ایسے مکتب کو۔ لڑکی کا منھ تو دیکھو کیا ذرا سا نکل آیا ہے۔" یہ کہہ کر جلدی سے لپک کر چٹاچٹ بلائیں لیں۔ حسن آرا کو گلے سے لگالیا۔ جس شخص پر حسن آرا کی طرح ایسی لونڈیوں کا غضب الٰہی اور ایسے نوکروں کی بلا مسلط ہو اُس کے مزاج کا درست رہنا عجب کی بات ہے۔ فرشتہ بھی ہو تو ایسی صحبت میں توبہ توبہ بھوت سے بدتر ہو جائے۔

حسن آرا بے چاری بھی اسی آفت میں مبتلا تھی۔ کوئی خرابی نہ تھی کہ اس کے مزاج میں نہ ہو اور کوئی بگاڑ نہ تھا کہ اس کی عادتوں میں نہ ہو۔ مکتب میں گئی تو شرافت، بدمزاجی، بدزبانی، خودپسندی، بیباکی، جنگجوئی، حسد، دروغگوئی، غیبت، بدلحاظی، تنگ چشمی، لالچ، بے صبری، سستی، بے ہنری، بدسلیقگی، اپنی قدیمی سہیلیوں کو ساتھ لیتی گئی۔ چونکہ اُستانی جی خود ماشاء اللہ امیر گھر کی بیٹی اور امیروں کے دستور اور قاعدے سے بخوبی واقف تھیں، ان کو تو حسن آرا کے چوچلے اور اس کے نوکروں کی ناز برداریاں دیکھ کر کچھ بھی اچنبھا نہیں ہوا۔ مگر مکتب کی لڑکیوں کو اچھا خاصہ تماشا مل گیا۔ کیسا پڑھنا اور کس کا سبق یاد کرنا۔ سب کی سب ٹکٹکی باندھ باندھ کر حسن آرا اور اس کے ساتھ والیوں کو دیکھنے لگیں۔

اصغری نے دیکھا کہ اسی سنگت نے حسن آرا کو پیٹ بھر کر بگاڑا ہے۔ اگر اب بھی یہ سنگ ساتھ موجود رہا تو تعلیم و تربیت کا اثر ہونا معلوم۔ مانی جی سے کہا کہ "اب ان لوگوں کو اجازت دیجیے کہ گھر کا کام کاج دیکھیں۔ مکتب کی لڑکیاں ہیں کہ انھیں میں محو ہو رہی ہیں اور حسن آرا بیگم کا دل بھی اُچاٹ ہوا چلا جاتا ہے۔"

مانی جی سمجھ دار تو تھی ہی سننے کے ساتھ سب کو رخصت کا اشارہ کیا۔ مگر لونڈیاں چلنے کا نام سن کر بے طرح مچلیں۔

ایک نے کہا: واہ! بھلا بے صاحبزادی کے مجھ کو ایک دم قرار ہوگا، گھر میں مجھ سے بیٹھا جائے گا؟

دوسری نے کہا: مانی ایسی نوکری کو سلام ہے۔ میں نے کچھ روٹی کپڑے کے لالچ سے نوکری نہیں کی۔ ایک اس بچی کی محبت، تنخواہ ہے تو یہ ہے اور انعام ہے تو یہ ہے۔

ان نوکروں کا مطلب یہ تھا، حسن آرا کے حیلے سے گھر کے کام دھندے سے بچیں۔

یہ سن کر اصغری نے کہا: بوا بیگم صاحب سے بڑھ کر محبت کا دعویٰ تو دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ وہی کہاوت ہے، ماں سے زیادہ چاہے پھاپھا کٹنی کہلائے۔ اور خدانخواستہ رخصت نہیں، وداع نہیں چار قدم پر گھر لگا ہے مکتب میں دیکھتی ہو، جگہ کی کتنی کوتاہی ہے۔ لڑکیوں میں تم سب کا اٹھنا بیٹھنا ان کے پڑھنے لکھنے میں ضرور ہرج ڈالے گا۔ بہتر ہے کہ اس وقت چلی جاؤ۔ اپنا اپنا کام دیکھو۔

اس پر بھی دو چار نے عذر کیا کہ آخر صاحبزادی کو پنکھا جھلنے، پانی پلانے کو ایک دو آدمیوں کا رہنا ضرور ہے۔

اصغری نے جواب دیا کہ: آخر ہم لوگ اپنا سب کام کاج اپنے ہاتھوں کرتے ہیں، اتنا کام بوا حسن آرا کا کردیں گے تو ہاتھ نہ گھس جائیں گے۔

غرض کہ زبردستی اصغری نے سب کو باہر ڈھکیلا۔ مانی جی بغدادی قاعدہ اور عم کا سپارہ بھی ایک کم خواب کے جزدان میں رکھ بغل میں داب لائی تھیں۔ چلنے لگیں تو وہ جزدان حسن آرا کو دینے لگیں۔

اصغری نے پوچھا کہ: یہ کیا ہے؟

مانی جی: بغدادی قاعدہ اور عم کا سپارہ ہے۔ دیکھیے تو سہی کیا پاکیزہ خط ہے۔

اصغری: مگر بالفعل اس کی ضرورت نہیں۔

مانی جی: آخر صاحبزادی کو کیا شروع کرایئے گا۔

اُستانی جی: ابھی تو کچھ بھی نہیں۔

مانی جی: کچھ بھی نہیں تو پھر مکتب میں بیٹھنے سے کیا حاصل؟

اصغری: مجھ کو تو ہتھیلی پر سرسوں جمانی نہیں آتی۔ حاصل حصول جو کچھ ہوگا، چند روز میں آپ ہی نظر آجائے گا۔ خلاف خواہش پڑھانا میرا دستور نہیں۔ پڑھنا پڑھانا بھی جبھی فائدہ دیتا ہے جب پڑھنے والا خواہش کرے ورنہ مارے باندھے کچھ پڑھایا بھی تو کیا۔ اوّل تو ایسا پڑھایا نہیں رہتا۔ دوسرے جب دل نہیں چاہتا تو زبردستی کرنے سے الٹا ذہن اور کند ہوتا ہے۔

مانی جی: سچ ہے، مگر بچوں کی خواہش پر ملتوی رکھا کریں تو پڑھنا لکھنا سب نیست و نابود ہو جاوے۔

اصغری: میں یہ نہیں کہتی کہ سب بچے شوق ہی سے پڑھا کرتے ہیں مگر میں نے اپنا یہی دستور رکھا ہے کہ اوّل علم کا شوق دل میں پیدا کر دیتی ہوں۔ تب پڑھنا شروع کراتی ہوں۔

مانی جی: سبحان اللہ! شوق ہو تو پڑھنا کیا بڑی بات ہے۔ بے شوق سے برسوں میں نہ ہوا اور شوق والا مہینوں میں کر دکھائے۔ مگر صاحبزادی پڑھنے کے نام سے کوسوں بھاگتی ہیں۔ ان کو تو خدا ہی شوق دے گا تو ہوگا۔

اصغری: اجی مانی جی۔ انشاء اللہ! یہی حسن آرا بیگم پڑھنے کے لیے ہاتھ جوڑیں، پاؤں پڑیں، منتیں کریں، تب تو سہی۔

غرض کہ ساتھ والیاں تو سب رخصت ہوئیں۔ اب حسن آرا اکیلی اصغری

خانم کے پاس رہ گئی۔ اصغری اوّل تو خود بڑی زیرک تھی۔ حسن آرا کے قیافے اور تھوڑی ہی دیر کے طرز و انداز سے سمجھ گئی، دوسرے ایک محلے کا واسطہ۔ بہت کچھ پہلے سے سن سنا چکی تھی۔ غرض جو قباحتیں حسن آرا کی اصلاح میں پیش آنے والی تھیں، اصغری سب جان گئی تھی۔ خیریت اتنی تھی کہ حسن آرا کے مزاج میں جہاں دنیا بھر کی خرابیاں تھیں، ایک یہ اچھائی بھی تھی کہ ذہین اور سمجھ دار ہونے کے علاوہ نیک ذات بھی تھی۔ فوراً اس کا دل اچھی بات کا اثر قبول کر لیتا تھا اور اگر اس سے کوئی خطا ہو جاتی اور نرمی سے اس کو تنبیہ کر دیا جاتا تو قائل اور نادم ہو کر اپنی حرکت پر تاسف اور تلافی مافات میں کوشش کرتی۔ اتنی ہی بات کا سہارا تھا کہ اصغری خانم نے اس کی تعلیم کا بیڑا اٹھا لیا۔ اصل میں حسن آرا کا مزاج نہایت نیک تھا۔ ناز پروردگی اور دولت مندی سے جن خرابیوں کا پیدا ہونا ممکن ہے وہ البتہ بدرجۂ غایت اس کے مزاج میں اثر کر گئی تھیں۔ حسن آرا جب مکتب میں بیٹھی تو اصل خیر سے گیارھویں برس میں تھی اور ہر چند اس وقت تک مکتب میں لڑکیوں کی کچھ بہت بھیڑ بھاڑ نہ تھی تاہم اصغری کی نند محمودہ، زبیدہ، آمنہ، رابعہ، کلثوم، حلیمہ، کنیز فاطمہ، خیر النساء، ہاجرہ، شہر بانو، دس لڑکیاں مکتب میں بیٹھی تھیں۔

یہ لڑکیاں کچھ حسن آرا کی طرح سب کی سب امیر زادیاں تو تھیں ہی نہیں اکثر تو پیشہ وروں کی بیٹیاں تھیں اور بعض خوش باش نوکری پیشہ لوگوں کی۔ اگر چہ حسن آرا کے مقابلے میں سب کی سب غریب تھیں مگر بمقابلۂ یکدیگر کوئی زیادہ خوش حال تھی، کوئی متوسط الحال، کوئی نہایت غریب اور جس طرح ان کی حالتیں متفاوت تھیں، ان کی صورتیں اور سیرتیں بھی ضرور ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ مگر مکتب کی تعلیم نے سیرتوں کے اختلاف کو بالکل مٹا دیا تھا۔ یہ لڑکیاں باوجود یہ کہ کئی گھروں کی تھیں تاہم آپس میں ایسی ملی جلی رہتی تھیں کہ گویا سب کی سب سگی بہنیں ہیں۔ ان میں نہ کبھی لڑائی ہوتی، نہ کبھی کسی طرح کی رنجش پیدا ہوتی۔ صورتوں کے اختلاف کا رفع کر دینا تو اصغری کے اختیار میں نہ تھا۔ اتنا البتہ کر دیا تھا کہ کسی کے نزدیک اختلاف صورت کی کچھ وقعت باقی نہ رہی تھی۔ جو رنگ کی اجلی اور گوری چٹی تھی، وہ کبھی سیاہ فام اور کالی بھٹ کو نظر حقارت سے نہ دیکھتی، نہ اپنی صباحت پر ناز کرتی اور جس کا نقشہ اچھا تھا وہ کم رو سے نفرت نہ کرتی اور نہ اپنے چہرے مہرے کو دیکھ کر خوش ہوتی۔ امیری غریبی سے تو یہاں کچھ بحث ہی نہ تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ امیری کیا بلا ہے اور غریب ہونا بھی کچھ حقارت کی بات ہے۔ حسن آرا کا مکتب میں بیٹھنا تھا کہ صورت شکل اور امیری غریبی کے مضمون تازہ ہو گئے۔ اور حسن آرا آتے کے ساتھ ہی غریبوں کو دیکھ کر لگی تیوری چڑھانے اور منہ بنانے، پاس بیٹھنا تو درکنار، سرے سے غریب لڑکیوں کا مکتب میں ہونا اس کو ناگوار ہوا۔ اور صورت شکل پر تو حسن آرا کو اس بلا کا گھمنڈ تھا کہ بعض لڑکیوں کو دیکھ کر بے اختیار ہنس دیتی اور بے تامل کہہ بیٹھتی، ''صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل۔'' محمودہ اور حسن آرا سے ایک طرح کی پہلی جان پہچان تھی۔ دو چار دفعہ کسی کی شادی بیاہ میں دیکھنے بلکہ بات چیت کرنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ سو قاعدہ ہے کہ آدمی جو کسی نئی جگہ جاتا ہے تو وہاں کے لوگوں کا حال اپنے کسی جان پہچان والے سے پوچھتا ہے۔

حسن آرا محمودہ کے پاس تو بیٹھی تھی چپکے چپکے مکتب کی لڑکیوں کا حال محمودہ سے پوچھنے لگی۔

زبیدہ کی طرف اشارہ کر کے کہا: کیوں بوا محمودہ بیگم، یہ سامنے والی چیچک رو لڑکی تبارک کی روٹی کا سامنہ لیے ہوئے کون ہے۔

یہ کہہ کر حسن آرا آپ ہی آپ ہنسی اور اس اُمید سے کہ محمودہ ایسی پھبتی سن کر پھڑک جائے گی، محمودہ کا منہ دیکھنے لگی۔ یہاں محمودہ پر اس کا بالکل اُلٹا اثر ہوا۔ منہ سے تو کچھ نہ کہا مگر حسن آرا کی بات کو اس قدر حقارت سے سنا کہ اس کے چہرے سے یہ بات ظاہر ہو گئی اور بے رخ ہو کر جواب دیا کہ'' یہ امیر خاں کی حویلی میں رہتی ہیں، زبیدہ ان کا نام ہے، ان کے ابا رفو کا کام کرتے ہیں۔''

حسن آرا: اچھی کیسے رفوگر ہیں، بیٹی کے چہرے میں پاؤ بھر قیمہ لے کر رفو نہیں کرتے۔

محمودہ: بیٹی چیچک رو ہے، منہ پھٹ نہیں ہے، منہ پھٹ ہوتی تو رفو کرتے۔

حسن آرا: اور ان کے پہلو میں یہ دوسری کالی کالی کون ہے جیسے سیہ تاب کا میر فرش رکھا ہو۔

محمودہ: یہ بے چاری ایک غریب قلعی گر کی بیٹی ہے۔

حسن آرا: گھر کے گھر میں چہرے قلعی نہیں کرالیتی۔

محمودہ: امیروں کے گھر قلعی کرنے سے فرصت نہ ملتی ہوگی۔

حسن آرا: اچھی یہ کونے میں کون لڑکی بیٹھی ہے، اے ہے روتے میں اس کی صورت کیسی بدرونق ہو جاتی ہے۔

محمودہ: روتے میں سبھی کی صورت بگڑ جاتی ہے۔

حسن آرا: ہماری تو نہیں بگڑتی۔

محمودہ: آپ نے کیوں کر جانا۔

حسن آرا: میں نے روتے میں اپنا منہ آئینے میں دیکھا تھا تو خاصی پیاری پیاری صورت تھی بلکہ لال منہ ہو جانے سے چہرہ اور بھی گرم گرم نکل آیا تھا۔

محمودہ: روتی صورت کی تعریف میں نے آپ ہی سے سنی ہے۔ خیر آپ کو آپ کا بسورتا ہوا حسن مبارک رہے یہاں کوئی اس کا خواہاں نہیں۔

اسی طرح حسن آرا نے اور دو چار پھبتیاں کہیں مگر دیکھا تو محمودہ نے کچھ داد نہ دی۔ آخر حسن آرا کھسیانی ہو اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔

مگر پہلے ہی دن سے امیری کے زعم میں حسن آرا نے مکتب میں اپنا ایسا

تسلط بٹھانا شروع کیا کہ گویا سب لڑکیاں اس کی لونڈیاں ہیں اور بے تکلف لگی سب پر حکم چلانے۔

اصغری خانم کو ابتدا میں اس کا اہتمام ضرور تھا کہ حسن آرا کو مکتب سے بیدلی نہ ہونے پائے کیوں کہ ان کو بخوبی معلوم تھا کہ اگر کہیں اس کا جی اُچاٹ ہوا تو پھر ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے گی مگر یہ خدا کی بندی مکتب کی طرف رخ نہ کرے گی۔ مکتب کی لڑکیاں تو حسن آرا کا طرز مدارات دیکھ کر کھٹک چلی تھیں اور ایک عام نفرت حسن آرا کی طرف سے سب کو ہو گئی تھی۔ جتنا حسن آرا اپنے تیئں کھینچتی، لڑکیاں اس سے کنارہ کشی کرتیں اور جس قدر وہ بڑائی کرتی لڑکیاں اس کو ذلیل سمجھتیں۔

اصغری نے اشارے سے سب کو روک دیا اور محمودہ سے کہا کہ ''حسن آرا بہت اچھی لڑکی ہے اور بڑی عمدہ سہیلی تم کو ہاتھ لگی ہے۔ تھوڑے دن صبر کرو اور اس کو بیدل مت ہونے دو۔ بے چاری طائر وحشی کی طرح تازہ گرفتار قفس ہے۔ اگر کہیں تم نے اس کو بھڑکا دیا تو پھڑ پھڑا کر اڑ جائے گی اور پھر نہ پکڑائی دے گی اور اگر پرچا پایا تو دیکھنا کیسی کیسی میٹھی میٹھی صفیریں سناتی اور دلوں کو لبھاتی ہے۔ غرض ادھر تو لڑکیاں دل داری پر آمادہ ہوئیں اُدھر اُستانی جی نے پڑھنے لکھنے کا نام تک منہ سے نہ نکالا۔ پھر حسن آرا کو وحشت کی کیا وجہ تھی پہلے ہی دن لڑکیوں سے ایسی بے تکلف ہو گئی کہ گویا مدتوں ساتھ کی کھیلی ہوئی ہے اور خود فرمائش اور تقاضا کر کے محمودہ کی گڑیاں کھلوائیں۔

حواشی:

1. ان یکاد اشارہ ہے طرف ایک آیتِ قرآن مجید کے جو دفع نظر بد کے لیے پڑھ کر پھونک دیا کرتی ہیں وہ آیت یہ ہے: وَاِنْ یَکَادُالَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِھِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّکْرَوَیَقُوْلُوْنَ اِنَّہٗ لَمَجْنُوْنٌ۔

□□□

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ

مصنف: محمد حسن

پروفیسر محمد حسن نے اپنی اس تنقیدی کاوش میں ادب کی ماہیت، شناخت اور اس کے مجلسی رشتوں، مشرق و مغرب کی تنقیدی نظریات، ان میں یکسانیت اور اختلافات کی نشاندہی کرتے ہوئے ادب اور خارج کے تعلق، ادبی معیار اور ادیب کے سماجی رشتوں اور ان کی معنویت کا جائزہ لیا ہے۔ پوری کتاب سات حصوں اور اکیس ابواب میں منقسم ہے۔ ان حصوں اور ابواب میں تنقیدی ادراک کی ابتدا، افلاطون کے تنقیدی جائزے، ارسطو کی بوطیقا، روم میں تنقیدی نظریات، چینی ادب، جاپانی شاعری کے کلیدی تصورات، سنسکرت تنقید میں دھونی، النکار اور رس، عرب کے تنقیدی نظریات، ایران کے تنقیدی نظریات، زندگی اور تاریخ و تہذیب کے ادب پر اثرات، روس اور امریکا میں نئی تنقید، تشکیلیت اور ساختیت، ہیئتی تنقید، مارکسی تنقید اور تقابلی تنقید جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔

صفحات: 404، قیمت -/28 روپے

غزل

آبرو کے حالات زندگی کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ ان کا نام نجم الدین تھا عرف شاہ[1] مبارک، آبرو تخلص تھا۔ مشہور صوفی بزرگ محمد غوث گوالیاری کے پوتے[2] تھے نامور فارسی داں اور عالم خان آرزو کے رشتے دار[3] اور شاگرد تھے۔ گوالیار میں پیدا ہوئے سنہ پیدائش غالباً[4] 1095 کے لگ بھگ تھا۔ ملازمت شاہی[5] کے سلسلے سے وابستہ رہے اور غالباً اسی سلسلے میں فتح علی گردیزی[6] صاحب تذکرۂ گردیزی کے والد کی رفاقت میں نارنول میں بھی رہے دہلی آئے اور عہد محمد شاہی میں ''درویش منش اور مشرب قلندر'' مشہور تھے۔ 1146ھ میں دہلی میں انتقال ہوا تاریخ 24 رجب تھی اور ان کی قبر دلی میں مزار سید حسن رسول نما کے نزدیک ہے۔ بعض تذکرہ نویس ان اطلاعات میں اضافہ کرتے ہیں تو ان کے حلیے اور وضع قطع کے بارے میں چند جملے نقل کر دیتے ہیں۔ ''شخصے بود یک چشم و باریش و عصا'' اور ان کی یک چشمی دوستوں میں جملے بازی کا موضوع بنتی رہی۔

بعض تذکرہ نویسوں نے آبرو کی حسن پرستی اور عاشق مزاجی کا ذکر کیا ہے۔ قائم لکھتے ہیں کہ ''حسن پرستی میں بڑی شہرت تھی چنانچہ حسینوں کی آرائش کے سلسلے میں ڈیڑھ سو اشعار کی مثنوی بھی لکھی ہے۔''

حواشی:

1. صرف تاریخ محمدی میں ان کا نام شاہ مبارک اللہ اور کریم الدین کے تذکرے میں نجم الدین علی خان ملتا ہے۔

2-3. مجمع النفائس نسخہ، رام پور ص -579 بحوالہ کلب علی خاں فائق (اورینٹل کالج میگزین، لاہور مئی 1960)

4. مقالہ جناب قاضی عبدالودود، معاصر پٹنہ دور اول

5-6. یہ معلومات تذکرۂ گردیزی، مجموعۂ نغز، عقون نکات اور خوش معرکۂ زیبا سے حاصل کی گئی ہیں۔

کوئل نیں آ کے کوک سنائی بسنت رت
بورائے[1] خاص و عام کہ آئی بسنت رت
وہ[2] زرد پوش جس کوں[3] بھر آغوش میں لیا
گویا کہ تب گلے سیں لگائی بسنت رت
وہ زرد پوش جس کا کہ گن گاوتے ہیں ہم
شوخی نیں اس کی ناچ نچائی بسنت رت
غنچے نیں[4] اس بہار میں کنڈوا[5] یا (اپنا) دل[6]
بلبل چمن میں پھول کے گائی بسنت رت
ٹیسو کے پھول دشنۂ خونی ہوئے اسے
برہن کے جی کوں ہے یہ کسائی بسنت رت
گائے ہنڈول آج کلاونت ہلس ہلس
ہر تان پیچ[7] کیا کے پھلائی بسنت رت
بلبل ہوا ہے دیکھ سدا رنگ کی بہار
اس سال آبرو کوں[8] بن آئی بسنت رت

•

حواشی:

1. بولائے (د)
2. (د) میں نہیں ہے
3. جب کر (ک)
4. وہ زرد پوش جس کا کہ گاتے ہیں نام ہم + شوخی میں اس کا ناچ نچاتی بسنت رت
5. نے (د)
6. کرواد یا مسلسل (د)
7. غنچے کا اس بہار میں کنڈوا بنا ہے دل
8. بچ لا (د)

(دیوان آبرو، مرتبہ محمد حسن، شائع کردہ قومی اردو کونسل)

فیاض رفعت

محمود ہاشمی کی یاد میں

محمود ہاشمی ہمارے درمیان نہیں رہے کبھی خواب وخیال میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ اس طرح آنکھیں پھیرلیں گے اور ان کی تصویر آنکھوں میں پھرتی رہے گی۔ ان کے ساتھ تو پل دو پل کی ملاقات کو بھلانا بھی مشکل تھا۔ وہ تھے ہی اتنے سخن پرور کہ ان کے لفظوں کی خوشبو دل میں اتر جاتی تھی۔ خصوصی طور پر ادب کی کوئی بھی صنف ہو وہ لب کشا ہوتے تو جیسے سامری کا سحر جاگ اٹھتا۔ کلاسیکیت تو کلاسیکیت ترقی پسندی جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر وہ گھنٹوں گفتگو کرسکتے تھے۔ مشرقی ادبیات کے علاوہ مغرب کی کلاسیکی روایات کے بھی وہ رمز آشنا تھے۔ ان کی نگاہ عمیق اور مطالعہ وسیع تھا۔ ادب سے ان کا وہ رشتہ تھا جو ولی کا خدا سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی ''یوٹوپیا'' (utopia) برسوں کی ریاضت کے بعد تخلیق کی تھی۔ ولی اور ولایت، صوفی اور تصوف کے نازک رشتوں پر وہ مابعد الطبیعاتی نکتہ سنجیوں کے ربط باہمی کو ایک عجب سے عالم سکرات میں ربودگی اور شیفتگی کے ساتھ موضوع سخن بناتے تو فکر ونظر کے چراغ جل اٹھتے۔

محمود ہاشمی سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی یہ تو ٹھیک ٹھیک یاد نہیں۔ غالباً 1960 کے آغاز سے کچھ پہلے دلی کے کافی ہاؤس میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اور اس کے فوراً بعد اس ملاقات کی تجدید علی گڑھ میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ خلیل صاحب کی کتاب ترقی پسند ادب شائع ہوچکی تھی کلام آتش پر لکھا ان کا مقالہ نیاز فتحپوری کے رسالے نگار میں شائع ہوکر مقبول ہوچکا تھا۔ میرے پسندیدہ ادیبوں کی فہرست میں ان کا نام سرفہرست تھا۔ مجھے وہ بطور شاعر بھی بیحد پسند تھے اور ان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ ہندو پاک کے چھوٹے بڑے سبھی رسائل وہ بڑے شوق وذوق سے پڑھتے تھے۔ پاکستانی اور ہندوستانی رسائل میں میری چیزیں شائع ہوتیں تو وہ میرا دل بڑھاتے۔ اب یہ میری خوش بختی تھی میرے افسانوں پر سنجیدہ رائے دینے والوں میں محمود بھی شامل ہوگئے تھے جن دنوں علی گڑھ میں محمود ہاشمی کی آمد ہوئی میں علی گڑھ یونیورسٹی میں غالباً بی۔اے۔ سال اوّل کا طالب علم تھا یا پھر یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد بن باس کے دن کاٹ رہا تھا۔ محمود کے ساتھ زبیر رضوی اور فیض انصاری بھی تھے یہ لوگ ماہنامہ ''خیال'' کی تشہیر اور توسیع اشاعت کے سلسلے میں خلیل صاحب کے تعاون واشتراک کے لیے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ ماہنامہ خیال کاپٹی (مہاراشٹر) سے فیض انصاری نے جاری کیا تھا۔ رسالے کی مجلس ادارت میں محمود ہاشمی اور زبیر رضوی شامل تھے۔ یہ رسالہ بڑے طمطراق کے ساتھ شائع ہوا۔ یہ ترقی پسندی کا موید بھی تھا اور اس سے گریزپا بھی۔ نئے افکار وعقائد کے دروا ہورہے تھے ادب میں طبع سازی سے گریز کیا جارہا تھا تازہ ہواؤں میں جدید ذہن کی خوشبو شامل ہوچکی تھی گوپال متل کا ''تحریک'' ترقی پسندی اور ترقی پسندوں سے برگشتہ خاطر تھا اپنے تحفظات اور تعصبات کے باوجود نئی آوازوں کو فروغ دینے میں مدیر تحریک گوپال متل سالار قافلہ کا رول ادا کررہے تھے۔ بلراج مہرا، سریندر پرکاش، من موہن تلخ، کمار پاشی، بلراج کومل، کرشن موہن، بانی، چندر بھان خیال امیر قزلباش، شمونل احمد، اوصاف احمد، خان رومان جیسے نئے پرانے ادیبوں اور شاعروں کی مسلسل اور مستقل شرکت سے جدید ذہن کی نمائندگی ہورہی تھی۔ انھی دنوں محمود ہاشمی کے تعاون سے ایک سہ ماہی رسالے ''محور'' کا دلی سے اجرا ہوا، جس کے ذریعے محمود ہاشمی نے ایسے ترقی پسندوں کو کلی طور پر رد کردیا جنھوں نے اپنے مخالفین پر زوال پرستی کا الزام عائد کیا تھا۔

افسانہ نگاروں میں محمود، انتظار حسین، سریندر پرکاش اور بلراج مہرا کو لائق تحسین جانتے تھے۔ ممتاز شیریں کی غیر معمولی تنقیدی اور افسانوی صلاحیتوں کا بھی انھیں اعتراف تھا ''انگارے'' کی رشید جہاں بھی انھیں ملتفت کرتی تھیں۔ ان کا یادگار مضمون ''تخلیقی افسانے کا فن'' غالباً وشوناتھ درد کے رسالے ''تلاش'' دلی میں شائع ہوا تھا، جس میں خصوصی طور پر ممتاز شیریں اور انتظار کی افسانہ گوئی کو مرکزی حیثیت عطا کرتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں:

''ان دو افسانہ نگاروں نے کم از کم ہمیں یہ روشنی تو عطا کی کہ افسانہ تجربے سے گزر کر تخلیق کب بنتا ہے۔''

محمود ہاشمی، حسن عسکری اور سلیم احمد کی طباعی کے قائل تھے مگر ان کے اسیر نہیں تھے۔ وہ ادبی معاملات پر اظہار خیال کرتے وقت دور کی کوڑی لاتے تھے اور اچھے اچھوں کا پانی اتار دیتے تھے۔

جن دنوں میرا دلی میں قیام تھا محمود ہاشمی سے آئے دن ملاقاتیں رہتی تھیں۔ وہ حویلی حسام الدین میں رہائش پذیر تھے۔ میں تمار پور میں ایک سندھی فیملی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ ابوالحسنات حقی مجنوں کے ٹیلے پر ایک جھونپڑ پٹی میں دھونی رمائے ہوئے تھے۔ ہم دونوں دلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کررہے تھے۔ تنگی ترشی کا زمانہ تھا۔ اچھے کھانے کی تلاش میں پرانی دلی کا رخ کرتے اور بھری دوپہریوں میں سوالی بن کر محمود کی چوکھٹ پر کھڑے

ہوجاتے۔ وہ ہم دونوں کا بڑی خوشدلی سے استقبال کرتے اور نشست کے کمرے میں بیٹھادیتے۔ پرتکلف کھانوں سے ہماری شکم سیری کی جاتی۔ مزے مزے کی ادبی موشگافیاں ہوتیں۔ چائے کے لیے وہ ہمیں حویلی حسام الدین کے باہر لب سڑک واقع چائے خانے میں لے جاتے کبھی کبھی پان بھی پیش کرتے۔ رخصت کے وقت ہماری جیبوں میں زادِ راہ کے طور پر دو دو روپے ڈال دیتے۔ یاد پڑتا ہے حویلی حسام الدین کے داخلی دروازے پر بائیں تکو پر ایک چھوٹا سا تھیہ تھا جہاں شمس الحق عثانی گھڑیوں کے کل پرزے درست کرتے نظر آتے۔ انھیں افسانے لکھنے کا شوق تھا۔ صاحبزادہ مستحسن فاروقی کے ہفت روزہ پیام مشرق میں چھپتے رہتے تھے۔ محمود ہاشمی کے قریب آئے تو ادب کے ایسے دھتی ہوئے۔ کہ بی.اے.، ایم.اے. اور پی.ایچ.ڈی. کی یکے بعد دیگرے ڈگریاں حاصل کرتے چلے گئے۔ بہت دھوکے کھائے، مگر گاؤں کی چکی کی طرح دھن کے پکے تھے۔ لیکچرار ہوئے، ریڈر ہوئے اور اب جامعہ دہلی میں پروفیسر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔ ذہین آدمی ہیں۔ بیدی پر قابل قدر کام کیا ہے۔ محمود ہاشمی کی طرح فکشن پر ان کی گہری نظر ہے۔

انھی دنوں غالباً 1966 کی بات ہے شمس الرحمٰن فاروقی ''شب خون'' کے ساتھ ادب کی دنیا میں وارد ہوئے۔ ترقی پسندی زوال کے دہانے پر کھڑی تھی، ترقی پسندی کے بطلان میں جدیدیت وجود میں آئی۔ نارنگ اور فاروقی کی ان دنوں دانت کاٹی روٹی تھی۔ ان کی دیوانگی شوق کو ہوا دینے میں محمود ہاشمی پیش پیش تھے۔

''شب خون'' کے تیسرے شمارے میں پروفیسر احتشام حسین کا ایک مضمون ''ناول کی تنقید'' اگست 1966 میں شائع ہوا۔ جس کی روشنی میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک سوالنامہ ترتیب دیا اور اسے کلیم الدین، محمد حسن، مسیح الزماں، محمود ایاز اور شمیم حنفی کو اظہار خیال کے لیے بھیج دیا۔ ان سبھی حضرات کے جوابات ''شب خون'' کے مارچ 1967 کے شمارے میں شائع کردیے گئے اور اس طرح فکشن کی تنقید کے تعلق سے ادب میں ایک نئی بحث کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں فاروقی نے اردو افسانے میں انحراف کی ٹیڑھی لکیر کے عنوان سے ایک سمپوزیم کا اہتمام کیا۔ جس میں خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، رام لعل، محمود ہاشمی، شہریار، زبیر رضوی، کلام حیدری، نیّر مسعود، شاہد احمد شعیب، ابرار اعظمی، محبوب الرحمٰن فاروقی اور شمس الرحمٰن فاروقی شریک گفتگو رہے۔ اس سمپوزیم کی اشاعت شب خون ستمبر 1969 کے شمارے میں ہوئی۔ اس پر وہاب اشرفی نے ''مورچہ'' گیا میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا اور بعض سوالات قائم کیے۔ اس کی اشاعت کے فوراً بعد محمود ہاشمی نے وہاب اشرفی کے اعتراضات کا بھرپور جواب دیا۔ یہ بحث شدت اختیار کرتی گئی اور پورے گیارہ ہفتے تک چلتی رہی۔ محمود ہاشمی نے خصوصی طور پر فکشن کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ معاملہ یوں تھا کہ دلّی میں کناٹ پلیس پر واقع سنٹرل بک شاپ پر فکشن کی تنقید پر جو بھی کتاب آتی۔ اس کے پہلے قاری محمود ہاشمی ہوتے تھے۔ ان کا ذہن ایسا اخاذ کہ وہ جو بھی پڑھتے تھے اس کا ایک ایک لفظ ان کے ذہن میں محفوظ ہوجاتا تھا۔

بڑی فروگذاشت ہوتی اگر ہم یہاں شجاع خاور کا ذکر نہ کریں محمود کے وہ لنگوٹیا یار تھے کبھی کبھی تو ایسا گمان گزرتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کے لیے بنے ہوں۔ جہاں دیکھیے جس محفل میں دیکھیے وہ دونوں ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شجاع دلّی کالج سے انگریزی میں ایم.اے. کررہے تھے اور ابھی آئی.پی.ایس نہیں ہوئے تھے۔

انتقال سے کچھ دنوں قبل محمود ہاشمی کے مضامین کا مجموعہ ''انبوہِ زوال پرستاں'' کے نام سے شائع ہوا جس کے مطالعے سے ان کے خلاقانہ ذہن کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے نئے ذہن کی جو توضیح وتشریح انھوں نے کی ہے اس کے لیے اکیسویں صدی میں بھی انھیں یاد رکھا جائے گا۔

ادھر کچھ برسوں سے محمود ہاشمی خاموش تھے۔ اس سے پہلے کہ یہ خاموشی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی۔ انھوں نے پردہ کرلیا۔

□□□

پتہ:
328, ELDECO SREENS
Dream Villa, Gomti Nagar, Lucknow-226010

ہمارا نیا ای میل آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' سے خط و کتابت بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

فاروق احمد درویشپوری

نئے پیشہ ورانہ کورسیز میں کیریئر

دور حاضر میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے پیشہ ورانہ کورسیز (Job Oriented Courses) ناگزیر ہیں۔ جو اچھی تنخواہ کے حصول اور اپنی منفرد شناخت قائم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

لہٰذا اگر آپ بارھویں جماعت یا گریجویشن کا امتحان پاس کر چکے ہیں یا پھر تعلیم یافتہ بے روزگار ہیں تو کسی پیشہ ورانہ کورس میں ہی داخلہ لیں تاکہ تربیت کے فوراً بعد آپ کو نوکری مل جائے۔ آج کل تمام چھوٹے بڑے شہروں میں بہت سے ایسے سرکاری و غیر سرکاری ادارے وجود میں آ چکے ہیں جو تین مہینے سے تین سال کی مدت تک مختلف نوعیت کے کاموں کی تربیت دے کر روزگار فراہمی کا بندوبست کر رہے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

فارماسیوٹیکل مینجمنٹ
(Pharmaceutical Management)

قومی اور بین الاقوامی شہرت کی حامل بہت سی ایسی دوا ساز کمپنیاں ہیں۔ جن کو Medical Representative، ایریا منیجر اور سیلز منیجر وغیرہ عہدوں کے لیے تربیت یافتہ افراد کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا فارما بزنس مینجمنٹ میں سہ سالہ BBA دو سالہ، MBA اور سہ ماہی PG وغیرہ کورس کر لیں تو بہتر ہے۔ یہ سبھی کورس I.I.M.R. Pharma Business School, Delhi-92 کے ذریعے کرائے جاتے ہیں، جو UGC سے منظور شدہ IASI یونیورسٹی، سردار شہر (راجستھان) سے منسلک ہے۔

تعلیمی اہلیت: BBA میں داخلے کے لیے 10+2 امتحان آرٹس، کامرس یا سائنس سے پاس ہونا ضروری ہے۔ PG Diploma, MBA اور سرٹیفکیٹ کورس میں داخلہ کے لیے کسی بھی مضمون میں گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔

مواقع: ان کورسوں کی تکمیل کے بعد مختلف عہدوں پر تقرری کے لیے قومی اور بین الاقوامی دوا ساز کمپنیوں مثلاً Glaxy, Ranbaxy, Pfizer, Cipla Concept وغیرہ وقتاً فوقتاً اشتہار بھی نکالتی ہیں۔

داخلہ فارم: داخلہ فارم اور پراسپکٹس منگوانے کے لیے تین سو روپے (Rs.300/-) کا ڈیمانڈ ڈرافٹ یا منی آرڈر IIMR Pharma Business School کے نام سے روانہ کریں۔

پتہ: IIMR Pharma Business Shcool
D-354, Vikas Marg (Opposite Sub-way)
Laxmi Nagar, Delhi-110092

رابطہ فون نمبر: 011-65784427/65641862

موبائل: 09350184416, 09868448877

ویب سائٹ: www.iimrdelhi.com

ای میل: qnery@iimrdelhi.com

دیگر ادارے:
- Institute of Pharmaceutical Education & Research 15, Ideal Chamber, Ideal Colony, Plot No.8, Pune (Maharashtra)
- National Institute of Pharmaceutical Education, Mohali, Chandigarh-62
- SP Jain Institute of Management and Research, Munshi Nagar, Dadabhai Road, Andheri (West), Mumbai وغیرہ

جیریاٹرکس کیئر

بزرگ اور عمر دراز افراد کسی بھی قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے مشترکہ فیملی کا نظام قائم ہے۔ لیکن مغربی تہذیب کی چکاچوند میں یہ دم توڑ رہا ہے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے دیگر ممالک کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی Old Age Home کی بنیاد ڈال دی گئی ہے اور نئے نئے Old Age Home کھل رہے ہیں۔ جس میں کچھ خاص صلاحیت کے حامل افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بزرگوں کی صحت اور دیکھ بھال ایک جدا قسم کی صلاحیت کی متقاضی ہوتی ہے۔ لہٰذا اسی ضرورت کے پیش نظر ہندوستانی حکومت نے بزرگوں کی دیکھ بھال سے متعلق نئے Job Oriented Course شروع کیا ہے۔ جن کی تکمیل کے بعد آپ Old Age Home اور یتیم خانہ میں اپنی قسمت سنوار سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ کو بزرگوں سے ہمدردی ہے اور ان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، تو یہ کورس آپ کی خواہش کی تکمیل کے ساتھ ہی نوکری بھی دلا سکتا ہے۔

مواقع: بزرگوں اور ضعیفوں کی دیکھ بھال سے متعلق Job Oriented Course کرنے کے بعد سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں Consultant, Counsellors, HRD Professionals, Project Director Researcher وغیرہ عہدوں پر تقرری ہو سکتی ہے۔ آپ چاہیں تو خود ہی Old Age Home کھول کر بزرگوں کی خدمت کر سکتے ہیں۔

کورس: ضعیفوں کی دیکھ بھال سے متعلق تین طرح کے پیشہ ورانہ کورس کرائے جارہے ہیں۔ جیریاٹرکس کیئر میں یک سالہ PG ڈپلوما، ششماہی سرٹیفکیٹ کورس اور سماجی خدمت کرنے والے ادارے سہ ماہی مختصر مدتی کورس کرسکتے ہیں۔ ان کورسوں کے تحت ضعیفوں کی دماغی اور سماجی حالت، سماجی تحفظ کے طریقے، ان کی خوراک کی ضرورتیں، صحت سے متعلق طریقے اور ان کے شخصی مسائل کو حل کرنے کی خاص تربیت دی جاتی ہے۔

اہلیت: ان کورسوں میں داخلہ کے لیے امیدوار کو کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے کم از کم سیکنڈ ڈویژن سے گریجویٹ پاس ہونا چاہیے۔ سوشل سائنس، سوشل ورک اور Psychology وغیرہ مضامین سے گریجویٹ پاس کرنے والوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ سہ ماہی و ششماہی کورس کے لیے ہائی اسکول (میٹرک) 45فیصد نمبروں سے پاس ہونا ضروری ہے۔ جب کہ PG ڈپلوما میں کامیابی کے بعد ہی داخلہ ملتا ہے۔ واضح ہو کہ ان سبھی کورسوں میں داخلہ کے لیے سال میں دو بار داخلہ فارم جاری کیے جاتے ہیں۔

سب سے اہم ادارہ: National Institute of Social Defence نئی دہلی کے تحت ''نیشنل انسٹی ٹیوٹ آن کیئر فار ایلڈرلی'' ادارہ قابل تعریف کام کررہا ہے۔ جیریاٹرکس کورس کے لیے یہ ادارہ نمبرون تسلیم کیا جاتا ہے۔

رابطہ کریں: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ڈیفنس، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آن کیئر فار ایلڈرلی، نئی دہلی

فون: 011-26100058

ویب سائٹ: http://nice.nisd.gov.in/trainingresource.php

دیگر ادارے: ● اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی

ویب سائٹ: http//www.ignou.ac.in

● آئی ایم اے۔ اے۔ کے این سنہا انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

ویب سائٹ: http//www.imanational.com/aknsi/index.asp

پیری فیرل میتھمیٹکس

کمپیوٹر ہارڈ ویئر انجینئرنگ کے ساتھ اگر پیری فیرل میتھمیٹکس اینڈ نیٹ ورکنگ کا کورس کرلیا جائے تو IT سیکٹر میں جلد ہی نوکری مل سکتی ہے۔ جن اداروں میں یہ کورس کرائے جاتے ہیں وہاں Placement کی سہولت بھی دستیاب ہے۔

مواقع: موبائل کمپنیاں، بینک اور آئی ٹی کمپنیاں پیری فیرل میتھمیٹکس کی جدید ٹریننگ حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو فوراً ہی روزگار مہیا کرتی ہیں۔

اہلیت: اس ڈپلوما (14 ماہ/11ماہ) کے کورس میں داخلے کے لیے بارھویں جماعت آرٹس، کامرس یا سائنس سے پاس ہونا ضروری ہے۔

ٹریننگ کا میڈیم: ہندی اور انگریزی (جسے جدید زبان میں English کہتے ہیں۔)

اہم ادارہ: مشہور آئی ٹی کمپنی ویپرو (wipro) سے منسلک Net Expert, Noida کے تحت مذکورہ کورس کیا جاسکتا ہے۔

داخلہ فارم: داخلہ فارم اور پراسپیکٹس منگوانے کے لیے 300روپے کا D.D. یا M.O. ''نیٹ ایکسپرٹ، نوئیڈا-201301'' کے نام سے روانہ کردیں۔

پتہ: نیٹ ایکسپرٹ
سائی ایڈوانس انفوسسٹمس پرائیویٹ لمیٹڈ،
بی-60، سیکٹر-10، نوئیڈا-201301

رابطہ: فون: 0120-4346847

موبائل: 09910998233, 09871591138

ای میل: info@netxprtindia.com

ویب سائٹ: www.netxpert.india.com

دیگر معروف ادارے: ● الیکسکو ایل انٹرنیشنل، 13 انفوسٹی، مادھاپور، حیدرآباد

فون: 040-23101600

● سنٹر فار ڈیولپمنٹ آف اڈوانس کمپیوٹنگ (سی ڈیک) A-34، انڈسٹریل ایریا، فیز-8، موہالی۔ چنڈی گڑھ-160071

فون: 2237052

● آئی آئی ایچ ٹی

15، شری لکشمی کمپلکس، چوتھی منزل، سینٹ مارک روڈ، بنگلور، کرناٹک

فون: 51367777

● کوسا کمپیوٹرس

16، بین بلڈنگ، تیسری منزل، دت پاڑا، کراس روڈ نمبر-3، بوری ولی ایسٹ، ممبئی

ای میل: info@kosacomputers.com

● لائنکس لرننگ سینٹر

735، مارٹ روڈ، ہنومنت نگر، بنگلور، کرناٹک

ای میل: linux@vsnl.com

● پٹنہ کالج آف انجینئرنگ، پٹنہ یونیورسٹی،

پٹنہ -800005

● برلا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، میسرا، رانچی،

جھارکھنڈ -835215

● ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی،

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ -202001

● برلا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اینڈ سائنس، پیلانی،

راجستھان -333031

ہوابازی (Aviation)

اگر آپ ایئر ہوسٹس بننا چاہتی ہیں تو اس کے لیے کم از کم بارھویں کا امتحان کسی بھی Stream سے پاس ہونا چاہیے۔ پرائیویٹ اور بین الاقوامی Flying services میں داخلے کے لیے اتنی تعلیمی لیاقت کافی ہے جبکہ سرکاری فلائنگ سروسز مثلاً انڈین ایئر لائنز وغیرہ کے لیے گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔ 10+2 یا گریجویشن کے بعد ہوٹل مینجمنٹ، کیٹرنگ، سیاحت اور نرسنگ کی تعلیم حاصل کرچکی لڑکیوں کو تقرری کے دوران فوقیت دی جاتی ہے۔ ہندی اور انگریزی زبان کی اچھی جانکاری ہونی چاہیے۔ جو لڑکیاں کسی ایئر ہوسٹس اکادی یا انسٹی ٹیوٹ سے ایئر ہوسٹس، سول ایوی ایشن سے متعلق ڈپلوما، اڈوانس ڈپلوما حاصل کرچکی ہیں انھیں فوقیت دی جاتی ہے۔ ویسے ضروری تعلیمی اہلیت کے بارے میں تفصیلی جانکاری اشتہارات میں دی جاتی ہے۔ ایئر ہوسٹس، فلائٹ اسٹیوارڈس کے عہدے پر تقرری کے لیے عمر 19 تا 27 سال ہونی چاہیے۔ جبکہ نجی کمپنیاں 30 سال کی عمر تک بھی تقرریاں کرتی ہیں۔ کم از کم قد 157.5 سینٹی میٹر ہونا چاہیے۔ اسی تناسب میں وزن بھی ہونا چاہیے۔ جبکہ دور کی نظر 6/24 اور نارمل 6/6 ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی خوبصورت، خلیق، ملنسار، ہنس مکھ، پراعتماد، بلند حوصلہ اور غیر شادی شدہ ہونا چاہیے۔

نئی دہلی کے کیریئر زون کے تحت Advance Diploma in Air Hostess & Hospitality Management (یک سالہ) اور Diploma in Airhostess Training (6ماہی/شش ماہی) کورس کیا جاسکتا ہے۔ ان کورسوں کے تحت ایئر ہوسٹس کے عہدے کے لیے تمام ضروری تربیتیں دی جاتی ہیں۔ یہاں Placement کی بھی سہولت دستیاب ہے۔ مزید جانکاری، داخلہ فارم، پراسپیکٹس منگوانے کے لیے 280 روپے کا D.D. یا M.O. "Career Zone, New Delhi" کے نام روانہ کردیں۔

رابطہ کریں: کیریئر زون

196، رنگ روڈ، ستیہ نکیتن، ساؤتھ کیمپس، نزد دھولہ کنواں،

نئی دہلی -110021

فون: 011-24677211, 24677212

موبائل: 09891022444

ویب سائٹ: www.careerzoneonline.com

شاخ: کیریئر زون

2780، کیریئر زون بلڈنگ، بی ایم سی چوک، جی ٹی روڈ،

جالندھر (پنجاب)

فون: 081-4622902, 4611141

دیگر ادارے:

- ایئر ہوسٹس اکیڈمی، لاجپت نگر، نئی دہلی -110024
- سہارا ایوی ایشن اکیڈمی، مہیپالپور، نئی دہلی
- فری برڈ ایوی ایشن اینڈ مینجمنٹ سیریز، ترویندرم، کیرالہ
- ڈین ٹریول اینڈ ٹورز پرائیویٹ لمیٹڈ، بنگلور، کرناٹک
- پسیفک ایئرویز، پچھم وہار، نئی دہلی

انٹیریر ڈیکوریشن

آج کل مکان، دکان، بزنس سنٹر، کمرشیل کمپلیکس وغیرہ کی بیرونی اور اندرونی سجاوٹ کے لیے Interior Decorator کی مدد لی جاتی ہے۔ کثیر قومی کمپنیاں جو ہندوستان میں کاروبار کررہی ہیں اپنے دفتروں میں اپنے بزنس سے مماثلت رکھنے والی سجاوٹ کو اہمیت دیتی ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ہندوستانی کمپنیاں بھی اس ٹرینڈ پر چل پڑی ہیں۔ Global Vision کے سبب لوگوں میں کام کی جگہ کے ساتھ رہائشی مکانات کو بھی خوبصورت بنانے کا مقابلہ ہورہا ہے۔ ان تمام باتوں کے سبب یہ پیشہ آج کافی اہم ہوگیا ہے۔

ملازمت کے مواقع: انٹیریر ڈیکوریشن سے متعلق روزگار اساس کورس کرنے کے بعد قومی اور بین الاقوامی تعمیراتی کمپنیوں میں بھی تقرری ہوسکتی ہے بشرطیکہ تین چار سال کا تجربہ ہو۔

آپ آزادانہ طور پر بھی انٹیریر ڈیکوریٹر بن سکتے ہیں اور انٹیریر ڈیزائننگ میں ایڈوانس کورس کرکے غیر ممالک میں بھی شہرت اور دولت کما سکتے ہیں۔

کورس: انٹیریئر ڈیکوریشن کا کورس کئی طرح کا ہوتا ہے۔ سہ سالہ بیچلر ڈگری، دوسالہ پی جی ڈپلوما، ڈیڑھ سالہ اڈوانس ڈپلوما، یک سالہ ڈپلوما اور شش ماہی اور سہ ماہی سرٹیفکیٹ کورس، سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں کرائے جاتے ہیں۔

اہم ادارے: دیوی اہلیہ یونیورسٹی، اسکول آف کنٹینوئنگ ایجوکیشن، تکسیلا احاطہ، کھنڈوا روڈ، اندور

ویب سائٹ: www.davniv.ac.in

کورس: دوسالہ ڈپلوما ان انٹیریئر ڈیزائن

جواہر لال نہرو ٹیکنالوجی یونیورسٹی، کُکٹ پلی، حیدرآباد

ویب سائٹ: www.jntv.ac.in

کورس: ایم آرک، انٹیریئر ڈیزائن، مدت: دوسال، اہلیت: بیچلر آف آرکیٹکچر، ناگپور یونیورسٹی، رویندر ناتھ ٹیگور مارگ، ناگ پور

ویب سائٹ: www.nagpuruniversity.org

کورس: بیچلر آف انٹیریئر ڈیزائن، مدت: چار سال،

کورس: ایم ٹیک انٹیریئر ڈیزائن، مدت: دوسال

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فیشن ڈیزائننگ، 2B مدھیہ مارگ، سیکٹر-27، چنڈی گڑھ

ویب سائٹ: www.nifd.net

کورس: بی ایس سی، انٹیریئر ڈیزائن، مدت: تین سال

کورس: اڈوانس ڈپلوما ان انٹیریئر ڈیزائن، مدت: دوسال

کورس: ڈپلوما ان انٹیریئر ڈیزائن، مدت: ایک سال

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

ویب سائٹ: www.ccsuniversity.org

کورس: پی جی ڈپلوما ان انٹیریئر ڈیزائن اینڈ ڈیکوریشن، مدت: ایک سال

اکادمی آف انٹیریئر ڈیکوریشن، 107/14، شکتی نگر، دہلی 110007-

ویب سائٹ: www.interiorcourses

کورس: ہابی (Hobby) کورس، سرٹیفکیٹ کورس، مدت: ششماہی

پتہ:
82, Hospital Road, Kamarhati Sharif, Kolkata-700058

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں محاسبہ، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت: -/96 روپے

انقلاب 1857

مرتب: پی. سی. جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دوررس اثرات مرتسم ہوئے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے یہ پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات پر، اس کے اثرات کا ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں نے بھی جائزہ لیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات: 386، قیمت: -/215 روپے

اقبال محی الدین

روایتی اور غیر روایتی توانائی

انسانی زندگی کی نقل و حرکت کا خاصا انحصار توانائی پر ہے۔ آج جس بڑے پیمانے پر توانائی کا استعمال ہو رہا ہے اس سے خدشہ یہ ہے کہ توانائی کے ذخائر بہت دنوں تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔ توانائی کے یہ ذخائر اور ذرائع ماحول کو بھی آلودہ کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں توانائی کے متبادل ذرائع تلاش کرنے ہوں گے تاکہ توانائی کے ساتھ ساتھ ماحول کو بھی آلودگی سے بچایا جاسکے اور یہ تبھی ممکن ہوگا جب ہم تیل، کوئلہ، لکڑی، گوبر کے علاوہ دھوپ، ہوا، پانی اور دیگر توانائی کے قدرتی ذرائع کو استعمال کریں۔

روایتی توانائی کے ذرائع ہیں کوئلہ، معدنی تیل، لکڑی اور گوبر وغیرہ جبکہ غیر روایتی توانائی حاصل کرنے کے ذرائع ہیں شمسی توانائی، آبی توانائی، ہوائی توانائی، پودوں سے حاصل کردہ توانائی، جوہری توانائی، بائیو گیس اور ارضی حرارتی توانائی۔

کوئلہ، معدنی تیل اور برقاب توانائی حاصل کرنے کے تین اہم وسائل ہیں جن میں جوہری توانائی کا اضافہ ابھی حال میں ہوا ہے۔ کوئلہ توانائی کے حصول یا صنعتی ایندھن کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ کوئلے کی تین قسمیں ہوتی ہیں (1) اینتھراسائیٹ (Anthracite)، (2) بیٹومینس (Bituminus)، اور لگنائیٹ (Lignite)۔ ان میں سب سے عمدہ قسم اینتھراسائیٹ کوئلے کی ہوتی ہے جس میں دھواں کم نکلتا ہے اور یہ بہت گرمی دیتا ہے۔ دوسری قسم میں دھواں نسبتاً زیادہ نکلتا ہے مگر یہ بھی کافی گرمی دیتا ہے۔ تیسری قسم میں آنچ کم اور دھواں بہت ہوتا ہے۔ کوئلہ ریاست بہار، مغربی بنگال، اڑیسہ، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش اور تمل ناڈو میں دستیاب ہوتا ہے۔ ہندوستان کے کُل کوئلے کے ذخیروں کا 80 فیصدی حصہ بہار تا مغربی بنگال کی کوئلے کی پٹی میں ہے اور یہ پٹی وادیِ دامودر میں واقع ہے۔ اس پٹی کے اہم کوئلے والے علاقے رانی گنج، ڈالٹن گنج، جھریا، گری ڈیہہ، بوکارو اور کرن پورا ہیں۔ کوئلے کے دیگر خطّے گوداوری، وردھا، سون مہاندی اور ست پڑا، چھتیس گڑھ اور دیوگڑھ کے علاقوں میں ہیں۔

ہندوستان میں تقریباً 31 فیصدی کوئلے کی کھپت صرف ہندوستانی ریلیں کرتی ہیں۔ تقریباً 19 فیصدی کوئلے کی فولاد کی صنعت کو ضرورت ہوتی ہے۔ 11 فیصد کوئلے کی کھپت حرارتی بجلی تیار کرنے والے بجلی گھروں میں ہوتی ہے اور 12 فیصد کوئلے کا استعمال سیمنٹ کے کارخانوں، کپاس اور پٹ سن کی ملوں، انجینئری کا سامان بنانے والی فیکٹریوں اور کیمیائی صنعت میں ہوتا ہے۔

کوئلے کے علاوہ قدرتی تیل یا پٹرولیم، توانائی حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ ہے اور یہ نہایت کارآمد ایندھن بھی ہے۔ کچے قدرتی تیل سے ہمیں مٹی کا تیل، ڈیزل، پٹرول، اسپرٹ، کھانا پکانے کی گیس وغیرہ حاصل ہوتی ہے۔ ہماری روزانہ کی زندگی میں قدرتی تیل اور اس سے بنی ہوئی اشیا کی بہت ضرورت رہتی ہے۔ اسکوٹر، موٹر سائیکل، کار، بسیں، ریل گاڑیاں، جہاز اور ہوائی جہاز وغیرہ پٹرول اور ڈیزل سے چلتے ہیں۔ ان کے علاوہ فیکٹریاں اور ملیں بھی ڈیزل یا پٹرول سے چلتی ہیں۔ غرض یہ کہ قدرتی تیل یا پٹرولیم ہماری معاشی زندگی کی شہ رگ ہے۔

ہمارے ہاں آسام، گجرات، باسبے ہائی میں تیل کے چشمے ہیں۔ ان چشموں سے تیل نکالا جاتا ہے اور وہ خام تیل کارخانوں میں صاف کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ ممبئی، چنئی، وشاکھاپٹنم، کوچین، بڑودا، متھرا، برونی، ہلدیہ اور گوہاٹی میں تیل صاف کرنے کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ قدرتی گیس بھی زمین کے نیچے پائی جاتی ہے۔ اس کا استعمال کھانا پکانے میں کیا جاتا ہے۔ آج کل اس کا استعمال فیکٹریوں کو چلانے میں بھی کیا جارہا ہے۔

ہمارے تیل کے دریافت شدہ ذخیرے اور ان سے خام تیل کی پیداوار دنیا کے تیل کے ذخیروں اور پیداوار کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ ہماری ضرورت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے ہندوستان کو اپنی ضرورت کا دو تہائی تیل باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔

ہندوستان میں چند خاص قسم کے معدنی ذخائر ہیں جن سے ایٹمی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ ایٹمی توانائی کی موجودہ دور میں بہت زیادہ معاشی اور جنگی اہمیت ہے۔ یورینیم، تھوریم، لمنائیٹ، مونازائیٹ، زرکان، سلی مینائیٹ اور بیریلیم سے ایٹمی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ یورینیم بہار میں ملتا ہے۔ کیرالا کے ساحل پر غیر معمولی ریت کے جماؤ کا بڑا علاقہ ہے جس سے تھوریم نکالا جاتا ہے۔ ایسا اندازہ ہے کہ اس ریت میں تقریباً بارہ کروڑ ٹن لمنائیٹ اور بڑی مقدار میں مونازائیٹ، زرکان اور سلی مینائیٹ ہے۔ بیریلیم راجستھان میں ملتا ہے۔

ہندوستان میں کئی ایٹمی توانائی اسٹیشن کام کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے پرانا اسٹیشن مہاراشٹر اور گجرات کی سرحد پر واقع تاراپور میں ہے۔ یہ 1969 میں قائم کیا گیا تھا اس سے 420000 کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔

ایک ایٹمی توانائی اسٹیشن راجستھان میں کوٹا کے قریب رانا پرتاپ ساگر بند پر اور ایک تمل ناڈو میں چینئی کے قریب کلپاکم میں ہے۔ ان دونوں کی پیداواری استعداد تاراپور کے برابر ہے۔ ہندوستان کا چوتھا ایٹمی توانائی اسٹیشن مغربی اتر پردیش میں بلند شہر کے قریب نرورا میں ہے۔ اس اسٹیشن سے حاصل شدہ بجلی کا استعمال زراعتی ترقی کے لیے ہورہا ہے۔

توانائی کے دوسرے متبادل ذرائع ہیں آبی توانائی، ہوائی توانائی، بائیوگیس، ارضی حرارتی توانائی، کوڑے کرکٹ سے تیار کی جانے والی اور شمسی توانائی۔

آبی توانائی یعنی سمندر یا دریا کی لہروں سے توانائی حاصل کرنا۔ سمندر سے توانائی حاصل کرنے کی تاریخ تقریباً ایک صدی پرانی ہے۔ 1881 میں فرانس کے سائنس داں J.D. Arsalowal نے سب سے پہلے اس سلسلے میں کوشش کی تھی۔ اس کو تھوڑی کامیابی ملی۔ مگر کلائیڈ نامی سائنس داں نے 1929 میں پوری کامیابی حاصل کی۔ 1977 میں فرانس کے سینٹ مالو کے مقام پر دریائے فرانس کے دہانے پر 70 کلومیٹر لمبا دہانہ بنایا گیا اور اس پر 24 جنریٹر نصب کیے گئے۔ اس سے 240 میگاواٹ بجلی حاصل ہورہی ہے۔ بعض سائنس دانوں کے مطابق بحرالکاہل میں ایک عام لہر کی ایک میٹر لمبائی میں تقریباً 50 کلوواٹ توانائی کی طاقت چھپی ہے۔ جن ممالک کے سمندری ساحلی علاقے لمبے ہوں گے وہ اس سے زیادہ فائدہ اٹھاسکیں گے۔ چونکہ ہندوستان کے پاس 4,800 کلومیٹر لمبا سمندری ساحل ہے اس لیے اسے آبی توانائی میں خودکفالتی کے بھرپور مواقع ملیں گے۔

ہوائی چکیوں سے بھی توانائی یعنی بجلی حاصل کی جارہی ہے۔ یہ ہوائی چکیاں کس قدر مؤثر ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بڑے سائز کی چار لاکھ ہوائی چکیوں سے جس قدر بجلی حاصل ہوگی وہ پورے یورپ کو اس وقت درکار بجلی سے بھی تین گنا زیادہ ہوگی۔ ساحلی علاقوں میں یہ چکیاں نصب کی جاتی ہیں جن میں ایک طرف سے تیز ہوا کی لہر داخل ہوتی ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتی ہے۔ اس عمل سے ان چکیوں کے اندر کا پہیہ حرکت میں آجاتا ہے اور یوں بجلی پیدا ہونے لگتی ہے۔

بائیوگیس کی ٹیکنالوجی اب ہندوستان میں بھی متعارف ہوچکی ہے۔ اس میں انسانی اور حیوانی فضلے، کوڑے کرکٹ، کھاد وغیرہ کو ملا دیا جاتا ہے جن کے ردِعمل سے میتھین (methene) گیس پیدا ہوتی ہے۔ اس کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ تیسری دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک جن میں ذرائع توانائی کم اور گراں ہیں وہاں یہ ٹیکنالوجی ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ بائیوگیس کا استعمال کھانا پکانے میں ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس سے بجلی بھی پیدا کی جارہی ہے۔

امریکہ اور چین میں اس ٹیکنالوجی سے بجلی کثیر مقدار میں پیدا کی جارہی ہے۔ ہندوستان میں بھی اس ٹیکنالوجی سے بجلی بنانے کا کام شروع ہوچکا ہے۔

ارضی حرارتی توانائی (Geo-Thermal Energy) کا بھی استعمال شروع ہوچکا ہے۔ زمین کی گہرائیوں میں حرارت کا بے شمار خزانہ دفن ہے۔ ماہرین ارضیات کے مطابق زمین کی اس پرت کے نیچے درجۂ حرارت 7200F° ہے یعنی 4000 سینٹی گریڈ ہے۔ حرارت اکثر آتش فشانوں کے علاوہ زمین کے مختلف حصوں سے خارج ہونے والی بھاپ کی شکل میں بھی ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ 1904 میں Geo-thermal Energy یا ارضی حرارتی توانائی کو کام میں لانے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ زمین کے اندر کی بھاپ کو پائپ کے ذریعے جرخاب تک لایا گیا اور اس سے بجلی پیدا کی گئی۔ زمین اندر سے بہت گرم ہے اور اس میں جگہ جگہ پر گرم پانی کی دھار یا سوکھی بھاپ کی تیز دھار پھوٹتی رہتی ہے۔ اس حرارت کو اگر توانائی میں بدل دیا جائے تو ہزاروں سال تک کے لیے توانائی کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

کوئلے سے پٹرول تیار کرنے کا طریقہ جنوبی افریقہ میں شروع ہوا۔ وہاں کوئلے کی کانیں وافر مقدار میں کوئلہ فراہم کرسکتی ہیں۔ مگر یہ طریقہ بہت مہنگا ہے اور اس میں کوئلے کی کھپت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

کوڑاکرکٹ سے بھی توانائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ امریکہ میں سالانہ 25 کروڑ ٹن کوڑا پھینکا جاتا ہے۔ اس سے دس کروڑ ٹن کوئلے کے برابر توانائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

پودوں سے بھی پیٹرول حاصل کیا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ گنے کے رس سے جو الکوہل (Alcohol) بنائی جاتی ہے اس الکوہل کو بطور پیٹرول استعمال کرکے گاڑی چلائی جاسکتی ہے۔ دنیا بھر میں پودوں سے الکوہل کا سب سے زیادہ ایندھن پیدا کرنے والا ملک برازیل ہے کیونکہ وہاں گنا بہت پیدا ہوتا ہے۔ اس تکنیک کا ہندوستان میں بھی استعمال ہورہا ہے۔

ونسپتی تیلوں سے تیار کردہ بایوڈیزل برطانیہ میں کئی پیٹرول پمپوں سے مہیا کرایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بنانے میں خرچہ زیادہ آتا ہے۔ دوسری دقت یہ بھی ہے کہ بایوڈیزل بنانے کے لیے بعض ایسے کیمیاوی مادّوں کی ضرورت ہوتی ہے جو تیلوں کو بایوڈیزل میں تو تبدیل کردیتے ہیں لیکن تیل میں موجود چند غیرضروری اجزا کے ردِعمل سے ایسے اضافی مادّے بھی بناتے ہیں جن کو الگ کرنے کے لیے اضافی خرچہ آتا ہے۔ باتھ یونیورسٹی، انگلینڈ، کے ماہرین نے کیمیاوی عمل میں معاون ایسے مادّے بھی ڈھونڈ نکالے ہیں جو کسی منفی ردِعمل کے بغیر کم خرچے میں تیلوں کو بائیوڈیزل میں تبدیل کردیتے ہیں۔

معدنی وسائل مستقل طور سے اور بے احتیاطی سے استعمال ہونے سے

جلد ختم ہو سکتے ہیں جن کو انسان دوبارہ نہیں بنا سکتا۔ اس لیے ان کا استعمال بہت احتیاط سے کرنا چاہیے۔ اگر ہم ایسے ایندھن کے وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں جو کبھی نہ ختم ہونے والے ہیں یعنی سورج، ہوا اور بہتا ہوا پانی وغیرہ۔ تو یہ انسانیت اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا اور قدرتی وسائل پر بھی کم دباؤ پڑے گا۔ اس طرح وہ لمبے عرصے تک قائم رہ کر ہمیں مستفید کرتے رہیں گے۔ آج کے سائنس داں سورج کی روشنی سے توانائی حاصل کرنے کے تجربات میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر سائنسی ترقی اسی رفتار سے ہوتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب سورج کی روشنی سے طاقت حاصل کر کے ہر وہ کام کیا جائے گا جو آج قدرتی تیل سے ہو رہا ہے، جس کے ذخائر محدود ہیں۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ سورج کی دھوپ اپنے آپ میں آلودگی سے پاک ہے اور سب کو آسانی سے میسر ہے۔ ہندوستان کو یہ سہولت حاصل ہے کہ سال کے 365 دنوں میں 250 سے لے کر 320 دنوں تک سورج کی پوری دھوپ ملتی رہتی ہے۔ دن میں سورج چاہے دس سے بارہ گھنٹے تک ہی ہمارے ساتھ رہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سورج کی گرمی ہمیں رات دن کے 24 گھنٹے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس میں نہ دھواں ہے، نہ کثافت اور نہ ہی آلودگی۔

دھوپ سے حاصل ہونے والی توانائی سولر انرجی یا شمسی توانائی کہلاتی ہے۔ دھوپ کی گرمی کو پانی سے بھاپ تیار کر کے جنریٹر چلانے اور بجلی بنانے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دھوپ قدرت کا عطیہ ہے جو ہر جگہ مفت دستیاب ہے۔ ہر روز ہماری دنیا پر اتنی دھوپ پڑتی ہے کہ اس سے کئی ہفتے کے واسطے بجلی تیار کی جا سکتی ہے۔

دہلی کے نزدیک گوالی پہاڑی میں سورج سے بجلی کی توانائی حاصل کرنے کے لیے ایک بجلی گھر بنایا گیا ہے جہاں پیداوار اور تحقیق کے کام کیے جا رہے ہیں۔ ملک کے دیگر حصوں میں Solar Photovoltaic Centres قائم کیے جا چکے ہیں جو ایک کلوواٹ سے ڈھائی کلوواٹ تک بجلی پیدا کرتے ہیں۔ گھروں، ڈیریوں، کارخانوں، ہوٹلوں اور اسپتالوں میں پانی گرم کرنے کے لیے ایسے آلات لگے ہیں جو 100 لیٹر سے لے کر سوا لاکھ لیٹر تک پانی گرم کر سکتے ہیں۔ شمسی چولہے ایک عام خاندان میں کم سے کم دو کلو لکڑی کی بچت کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اگر 17 کروڑ خاندان مان لیے جائیں تو روزانہ کم از کم 34 کروڑ کلو یا 34 لاکھ کوئنٹل یا 3.4 لاکھ ٹن لکڑی کی بچت کی جا سکتی ہے۔

توانائی تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے برطانیہ نے بھارت کو تعاون کی پیشکش کی ہے۔ دوسری جانب برطانیہ نے بھارت سے مدد کی درخواست بھی کی ہے تاکہ عالمی سطح پر بازاروں کو مسابقتی اور آزاد بنانے کے بین الاقوامی لائحہ عمل کو روبہ عمل لایا جا سکے۔ نئی دہلی میں متبادل ایندھن کے موضوع پر ہونے والی ایک کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے بھارت میں برطانوی ہائی کمشنر سر مائیکل آرتھر نے کہا کہ ''بھارت اور برطانیہ اپنی توانائی پالیسیوں کو ہم آہنگ کرتے ہوئے اپنے طویل مدتی مقاصد کی روشنی میں قابل قبول قیمت والی توانائی کے حصول کو یقینی بنا سکتے ہیں۔''

ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ پاک و صاف اور بہتر کارکردگی والی ایندھن ٹیکنالوجی کو عاجلانہ طور پر روبہ عمل لایا جائے اور روک ٹوک کے بغیر بازار میں اس کی فراہمی کی جائے۔

□□□

پتہ:
46, Nishat Apartments,
Near Shamshad Market,
Aligarh Muslim University, Aligarh

سائنس کی کہانیاں (حصہ اول)

مصنف: سکنف اور سکنف/ مترجم: ڈاکٹر انیس الدین ملک

سائنس ہماری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر موجودہ زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ زیر نظر کتاب میں کہانیوں کی مدد سے مختلف اشیا کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے اور ان سے متعلق تمام جانکاری بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 152، قیمت -/18 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

انسان فطری طور پر تجسس پسند واقع ہوا ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوالات انسان کے ذہن میں ہمیشہ گونجتے رہے ہیں اور یہی سوالات مختلف ایجادات و انکشافات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ ''کیمیا کی کہانی'' میں بعض اہم عناصر مثلاً آکسیجن، بجلی، سوڈا، کیلشیم، میگنیشیم اور ریڈیم وغیرہ کی دریافت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

صفحات: 128، قیمت -/16 روپے

گری راج اگروال

گلوب
ہندوستانی اسکولوں میں عالمی چمک

ایم جی این پبلک اسکول، جالندھر، پنجاب کے طالب علم نشانت دانیہ اور اس کے ساتھیوں نے کسی دن امریکی فضائی اور خلائی ادارے، ناسا کے سائنسدانوں کے ساتھ کام کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ کلپنا چاؤلہ اور سنیتا ولیمس کے کارناموں سے انھیں یہ تحریک ملی تھی۔ لیکن جب 2006 میں ان کا اسکول ناسا کے گلوب کلاؤڈ سیٹ پروجیکٹ میں شامل ہو گیا تو ان طلبہ کو ان کی توقعات سے پہلے وہ موقع مل گیا۔

ماحولیاتی سائنس اور تعلیمی پروگرام کے شرکا کے طور پر یہ طلبہ آسان سا کام انجام دے رہے ہیں جیسے کہ بادلوں کا مشاہدہ کرنا، بارش کی پیمائش اور فضائی حرارت کو ریکارڈ کرنا۔ ناسا کے سائنسداں تغیر پذیر آب و ہوا کو سمجھنے کے لیے مصنوعی سیاروں کے ذریعے حاصل شدہ تصویروں کے تجزیے میں ان کے اکٹھا کیے ہوئے ڈاٹا کو استعمال کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی دانیہ اور اس کے ساتھیوں نے بادلوں اور ان پر کثافتوں کے اثرات کے بارے میں بھی بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ دانیہ کہتے ہیں کہ ''اب میں بادلوں کا چارٹ دیکھے بغیر ہی کسی بھی بادل کی نوعیت کو سمجھ جاتا ہوں۔'' ان کی ٹیچر اور پروگرام کوآرڈی نیٹر رجنیش کور بہت خوش ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ''ایک ایسے پروجیکٹ پر کام کرتے ہوئے مجھے فخر کا احساس ہوتا ہے، جو مشہور امریکی سائنسدانوں سے ہمارے طلبہ کو جوڑتا ہے۔''

ایم جی این پبلک اسکول میں کلاؤڈ سیٹ پروگرام، گلوبل لرننگ اینڈ آبزرویشنس ٹو بینی فٹ دی انوائرمنٹ (گلوب) نام کے ایک عالمگیر پروگرام کا حصہ ہے جس کے لیے ناسا، امریکی نیشنل سائنس فاؤنڈیشن اور امریکی محکمۂ خارجہ سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور یہ ناسا اور یونیورسٹی کارپوریشن فار اسٹماسفیرک ریسرچ، بولڈر، کولوریڈو کے درمیان تعاون کے ایک معاہدے کے تحت کام کرتا ہے۔ مقامی موسم اور ماحول کے متعلق معلومات اکٹھا کرنے کا 14 برس سے جاری یہ پروگرام 110 ملکوں کے طلبہ، ٹیچروں اور سائنسدانوں کے درمیان رابطہ فراہم کرتا ہے۔

اس پروگرام کے خاص مقاصد سائنس کی ٹیچنگ اور ٹریننگ کو فروغ دینا اور ماحولیاتی تعلیم کا پھیلاؤ اور اس راہ میں رہنمائی ہے۔

گلوب کے بین الاقوامی ڈویژن کی ڈائرکٹر ٹریسا کینیڈی نے بتایا کہ ''دنیا بھر میں 22 ہزار اسکولوں سے تعلق رکھنے والے 50 ہزار سے زیادہ ٹیچر گلوب کے تربیت یافتہ ہیں۔ تحقیقات پر مبنی سائنسی پروجیکٹوں میں استعمال کرنے کے لیے طلبہ نے دو کروڑ سے زیادہ پیمائشیں گلوب ڈاٹا بیس میں درج کرائی ہیں۔''

اگست 2000 میں جب امریکی سفارتخانہ اور ہندوستانی وزارت ماحولیات اور جنگلات کے درمیان معاہدے پر دستخط ہوئے اس وقت 50 ہندوستانی اسکولوں کا ایک گروپ اس پروگرام میں شریک ہوا۔ راجیندر رہتا نے بتایا کہ جب جنوری 2002 میں سائنٹفک ڈاٹا اکٹھا کرنے کے طریقے سکھانے کے لیے ''تربیت دینے والوں کی ٹریننگ کا کام شروع ہوا تو اس پروگرام میں تیزی آئی۔'' راجیندر رمہتا گلوب انڈیا کے کوآرڈی نیٹر، بین الاقوامی مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین اور ہندوستانی وزارت ماحولیات و جنگلات کے مشیر ہیں۔

ہندوستانی ماحولیاتی سوسائٹی 2002 سے اس پروگرام کا انتظام کر رہی ہے۔ سوسائٹی کے صدر اور گلوب ایشیا بحرالکاہل علاقائی آفس کے ڈائرکٹر دیش بندھو نے بتایا کہ ''ہندوستان بھر کے دو ہزار سے زیادہ اسکولوں سے ہم نے شراکت کر لی ہے اور 1800 سے زیادہ ٹیچروں کو گلوب کے طریقۂ کار کی ٹریننگ دے چکے ہیں۔''

تحقیق کے چار میدانوں میں ٹریننگ دی جاتی ہے۔

- فضا: جس کے زیر اہتمام بادلوں کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، بارش کی مقدار اور اس میں تیزابیت کی سطح کی پیمائش اور ہوا کے درجۂ حرارت کی ریکارڈنگ کی جاتی ہے۔
- آبی مطالعہ: جس کے مطابق پانی کے اجزا کا مطالعہ اور پیمائش کی جاتی ہے۔ اس کی شفافیت، اس میں حل آکسیجن کی مقدار، اس کا درجۂ حرارت، اس کی برق باری، کھار، چونے اور نائٹریٹ کی مقدار کی پیمائش کی جاتی ہے۔
- مٹی: جس میں رنگ اور ساخت، کمیت، ذرات کے سائز، pH ویلو، نمی کی مقدار، کثافتیں، درجۂ حرارت اور زرخیزی ریکارڈ کی جاتی ہے۔

● حیاتیات: جس کا مطلب ہے نباتات کی فہرست سازی، انواع کی شناخت، درختوں کی گولائی، اونچائی، ان کی چھتری اور ان سے ڈھکی ہوئی زمین کی پیائش اور گھاس کی نباتاتی مقدار۔

اسکولوں کو جو کٹ فراہم کی جاتی ہے اس میں وہ سارے آلات ہوتے ہیں، جن کی طلبہ کو اپنی پسند کے مطابق مطالعے کے لیے ڈاٹا اکٹھا کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات کی رپورٹ گلوب کی ویب سائٹ کو بھیج دیتے ہیں۔ بندھو نے بتایا کہ ''کسی مخصوص مطالعے کے لیے ٹیچر آٹھ دس طلبہ کا گروپ بنا دیتے ہیں۔''

گلوب کلاؤڈ سیٹ پروگرام پنجاب کے آٹھ اسکولوں میں جاری ہے۔ چار جالندھر میں اور چار موہالی میں۔ ان میں پرائیویٹ اور سرکاری، دونوں طرح کے اسکول شامل ہیں۔ موہالی کے پارا گاؤں سینئر سیکنڈری اسکول کی پرنسپل انو جا ٹیگھارے نے بتایا کہ ''جس جس دن کلاؤڈ سیٹ مصنوعی سیارہ اسکول کے اوپر سے گزرتا ہے، جس کا طلبہ کو پہلے سے علم ہوتا ہے، 8ویں سے 12ویں جماعت تک کے طلبہ کا ایک گروپ اسکول گراؤنڈ میں بادلوں کے مشاہدے کرتا ہے۔''

پنجاب ریاستی کونسل برائے سائنس اور ٹیکنالوجی کی نیلما جیرتھ کہتی ہیں کہ ''بچے کلاؤڈ سیٹ پروگرام سے واقعی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ امریکی سائنسداں میٹ روجرس اور سندی مک کلرگ کے دوروں کی وجہ سے اور زیادہ کام کرنے پر ان کی حوصلہ افزائی ہوئی کیونکہ انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ایک واقعی ریسرچ پروجیکٹ کا حصہ ہیں۔''

اور پنجاب کے طلبہ کا اکٹھا کیے ہوئے ڈاٹا کا کیا ہوا؟ کولوریڈو اسٹیٹ یونیورسٹی، فورٹ کولنس میں ریسرچ سائنٹسٹ راجرس کہتے ہیں'' کلاؤڈ سیٹ ایجوکیشن نیٹ ورک سے وابستہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تقریباً 132 اسکولوں کے، جن میں پنجاب میں واقع آٹھ اسکول بھی شامل ہیں، دو سال کے دوران اکٹھا کیے ہوئے ڈاٹا کو میں نے استعمال کیا۔ ان طلبہ نے بادلوں کی جو نوعیتیں بیان کی تھیں ان کا موازنہ ان تصویروں سے کیا جو سٹلائٹ نے ان اسکولوں کے اوپر سے گزرتے ہوئے لی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ اسکولوں کے ڈاٹا اور سٹلائٹ کے ڈاٹا میں 65 فیصد یکسانیت تھی اور یہ بڑا حیرت انگیز نتیجہ ہے کیوں کہ عالمی موسمیاتی تنظیم کے تربیت یافتہ ماہرین موسمیات نے اسی طرح کا مطالعہ کیا تو انھیں صرف 64 فیصد تک یکسانیت معلوم ہوئی۔'' وہ کہتے ہیں کہ ''سٹلائٹ کے ذریعے حاصل شدہ معلومات کے حساب کتاب پر ہمارا عمل جاری ہے اور طلبہ کے مشاہدات پر مبنی تحقیقی مواد میں کچھ تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں۔''

وہ کہتے ہیں کہ پنجاب کے اسکولوں سے حاصل ہونے والے ڈاٹا سے بادلوں کے متعلق اور ماحولیاتی تبدیلی میں ان کے عمل دخل کے بارے میں دنیا بھر کی معلومات میں براہِ راست بہتری آتی جارہی ہے۔ وہ ایک مقالہ لکھ رہے ہیں جو ایک سائنسی جریدے کو پیش کیا جائے گا، اس کے معاون مصنفین میں ان سارے طلبہ اور ٹیچروں کو شریک کیا جائے گا، جنھوں نے ہماری مدد کی۔

دیش بندھو کہتے ہیں کہ ''سب سے اہم بات یہ ہے کہ اب اسکول، اساتذہ اور طلبہ سائنٹفک تحقیق پر مبنی پروجیکٹ سے واقف ہوگئے ہیں۔ اس آگاہی کی وجہ سے وہ ماحول کی بہتری کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہیں۔'' انھوں نے ایسی دو مثالیں پیش کیں جن میں گلوب کے مطالعوں کا مقامی ماحولیاتی مسائل سے براہِ راست تعلق تھا۔ انھوں نے کہا کہ'' دو برس قبل جمنا ندی کا ایک آبی مطالعہ کیا گیا۔ دہلی کے 140 اسکولوں کے طلبہ نے دریا کے دس مقامات پر پابندی کے ساتھ پیائشیں کیں۔ اس سے انھیں جمنا میں آلودگی کا پتہ چلا اور اپنے آبی وسائل کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اسی طرح آگرہ کے آٹھ اسکولوں نے قومی اہمیت کی دو تعمیرات تاج محل اور آگرہ کے قلعے پر ماحولیاتی تبدیلیوں کے اثرات کا مطالعہ کیا۔'' یونیسکو، امریکی نیشنل سائنس فاؤنڈیشن اور ہندوستانی وزارت ماحولیات اور جنگلات گلوب پروگرام کے لیے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔

امریکی سفارت کار ہندوستان بھر میں 50 سے زیادہ اسکولوں کو گلوب کے کٹ تقسیم کررہے ہیں جن میں امرتسر، لدھیانہ، جے پور، رائے پور، ناندیڑ، میسور، کٹک اور وشاکھا پٹنم کے اسکول شامل ہیں۔ جو پانچ میٹرو شہروں کے باہر ہیں۔ امریکی سفارتخانہ، نئی دہلی میں سفارت عامہ کی افسر ڈیائن برانڈٹ کہتی ہیں کہ'' اس کا مقصد بچوں کو زیادہ فعال بنانا اور کلاس روم کو روزانہ کی زندگی کے موجودہ عالمی مسائل سے جوڑنا ہے۔''

گلوب پر کینیڈی نے بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ '' گلوب پروگرام کا بنیادی مقصد ایسے تحقیقی سوالات مرتب کرنے میں طلبہ کی مدد کرنا ہے جو ان کے گردوپیش کی دنیا کے ذاتی مشاہدوں پر مبنی ہوں۔ اور وہ اپنی تحقیق سے متعلق سوالات کا جواب دینے والے ڈاٹا اکٹھا کرنے کے لیے سائنٹفک طور پر آزمودہ گلوب کے فراہم کردہ 50 سے زیادہ آلات استعمال کریں۔''

(بشکریہ اسپین، ستمبر/اکتوبر 2009)

□□□

ایگن لارسن

(ہماری مطبوعات سے)

سورج سے توانائی

جوہری توانائی کے سوا انسان نے جب بھی کسی توانائی کو استعمال کیا ہے تو اس کا سرچشمہ ہمیشہ سورج رہا ہے۔ ہم لوگوں کو جس مقدار میں اور جس رفتار سے شمسی توانائی ملتی ہے اسی مقدار میں اور اسی رفتار سے اگر ہم دنیا کے سارے کوئلے، تیل اور قدرتی گیس کے ذخائر کو استعمال کریں تو یہ سارا کا سارا ذخیرہ تین دن کے اندر ختم ہو جائے گا۔ اگرچہ ہم سورج کی بے پایاں توانائی سے واقف تھے لیکن حال ہی میں ہم لوگوں نے اس وسیع اور لازوال طاقت کا استعمال شروع کیا۔

شمسی توانائی کو محصور کرنے کا سب سے قدیم طریقہ باغبان کا شیشے کا وہ گھر تھا جس میں وہ پودے رکھتا تھا۔ اس کا جدید روپ سورج سے پانی گرم کرنے والا، ہیٹر (heater) ہے۔ یہ عموماً گھوما ہوا پائپ ہوتا ہے جسے خفیف گہرائی والے بکس میں رکھ کر گھر کی چھت کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے۔ بکس کالے کنکریٹ (concrete) میں جما دیا جاتا ہے۔ کالے رنگ کی چیز سورج کی شعاع کو قبول کرتی ہے اور سفید چیز اُسے منعکس کر دیتی ہے۔ بکس کا بالائی حصہ شیشے سے ڈھکا ہوتا ہے۔ پائپ کے اندر چکر لگاتا پانی سورج کی شعاع سے گرم ہو جاتا ہے اور اسے گرم پانی کے ٹینک میں پمپ کر دیا جاتا ہے۔ گھر کے مکین گرم پانی اسی ٹینک سے حاصل کرتے ہیں۔ امریکہ کے صرف فلوریڈا شہر ہی میں تقریباً پچاس ہزار ایسے کنبے ہیں۔ جو گرم پانی اسی طرح حاصل کرتے ہیں۔ اسرائیل کے دیہی علاقوں میں یہ عام رواج ہے جو بھی نیا مکان بنتا ہے اس پر شمسی آبی ہیٹر لگائے جاتے ہیں۔

حرارتی پمپ نسبتاً زیادہ کارآمد ہوتا ہے اور ساخت میں پیچیدہ بھی۔ یہ درحقیقت ریفریجریٹر میں اپنائے گئے اصول کے برعکس طریقۂ کار پر عمل کرتا ہے۔ یہ فضا سے، زمین سے، ندی یا تالاب کے پانی سے اپنی بساط کے مطابق جس درجہ ممکن ہے تپش یکجا کر لیتا ہے۔ یہ تپش سردیوں میں کم اور گرمیوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس تپش کو انتہائی کم حرارت سے ابلنے والے رقیق (liquid) کو گیس میں تبدیل کرنے کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔ اب اسی گیس پر لیمپ کے ذریعے دباؤ میں اضافہ کیا جاتا ہے اور اسے کنڈنسر کے لچھوں میں داخل کیا جاتا ہے جہاں گیس پھر رقیق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس طرح رقیق بننے کے عمل میں خارج ہونے والی تپش کو گھر گرم کرنے، پانی گرم کرنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ حرارتی پمپ سے اس کے برعکس کام کرا کر گھر کو گرمیوں میں ٹھنڈا رکھا جا سکتا ہے۔

امریکہ میں ہزاروں کی تعداد میں شمسی گھر تعمیر کیے گئے ہیں۔ امریکہ میں انجینئر اور فن تعمیر کے ماہرین نے شمسی گھروں سے متعلق طرح طرح کی ڈیزائن نکالے ہیں۔ ان شمسی گھروں میں کسی نہ کسی واسطے کے ذریعے سورج کی گرمی کو ذخیرہ کیا جاتا ہے اور ضرورت کے حساب سے اسے رفتہ رفتہ کر کے استعمال کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے پانی اچھا وسیلہ ہے لیکن گلوبر سالٹ (Glauber's Salt) یا نم سوڈیم سلفیٹ اور بھی زیادہ کارآمد ہے۔ یہ 90 ڈگری فارن ہائیٹ پر پگھل جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ کافی مقدار میں گرمی بھی جذب کر لیتا ہے اور اس کی دوبارہ جب قلمیں بنتی ہیں تو حرارت کا اخراج ہوتا ہے۔ ایک شمسی گھر کے تہہ خانے میں حرارتی باسکٹ میں صرف بیس ٹن نمک موسم گرما میں ذخیرہ کی ہوئی حرارت سے سارے کمروں کو سردیوں میں گرم رکھ سکتا ہے۔

گھروں کو گرم رکھنے کا دوسرا دلچسپ طریقہ دیواروں میں کنکر لگانا ہے۔ بادل کے دنوں میں جب سورج نہیں نکلتا ہے تو یہ کنکریاں دیواروں کو گرم رکھتی ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ چھت پر رکھنے پر حرارت یکجا کرنے والے نظام سے ہوا کو گزار کر چھوٹے روشندان کے ذریعے دیوار میں لگی کنکریوں کے درمیان بھیجتے ہیں۔ کنکریاں گرمی کو جذب کر لیتی ہیں اور اُسے ایک انداز سے رہا کرتی رہتی ہیں۔

سورج کی تپش کو استعمال کرنے والی کوششوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہرین اور انجینئر بڑے پیمانے پر سورج سے حرارت کے حصول کے اس کے امکانات ہی سے واقف نہیں بلکہ اس کو کس حد تک کام میں لا سکتے ہیں اس کو بھی

"تاریخ ایجادات" سے ماخوذ، مصنف: ایگن لارسن، صفحات 399، قیمت: -/152

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

جانتے ہیں۔ بہتیرے ممالک میں خصوصی طور پر وہ علاقہ جس کو معتدل کہتے ہیں (سرد علاقوں کا ذکر ہی کیا) معتدل دھوپ اس قدر تیز نہیں ہوتی کہ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے شمسی گھر بنایا جائے۔ دوسری طرف گرم سیر خطے (tropical zones) ہیں جہاں زیادہ گرمی کی قطعاً ضرورت نہیں۔ لیکن شمسی توانائی روزمرّہ زندگی میں روز بہ روز اہم ہوتا جارہا ہے۔

ہندوستان میں ایندھن کی فراہمی محدود ہے۔ جانوروں کے گوبر کے اُپلے گھروں میں ایندھن کا اہم ذریعہ ہیں۔ گوبر کا جب کہ اس سے بہتر استعمال کھاد کی شکل میں کھیتوں کو اپجاؤ بنانے کے لیے کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں دھوپ بھی اچھی نکلتی ہے۔ ایک انگریز ڈبلو ایڈمس جو کہ ہندوستان میں ملازمت کرتے تھے انھوں نے 1890 میں ہی ایک سستے شمسی کوکر کو مقبول کرانے کی رائے دی تھی۔ ان باتوں کے مدنظر کوئی کامیاب شمسی کوکر نہیں بن پایا ہے جس کو کثیر تعداد میں عام استعمال کے لیے بنایا جائے۔ بالآخر ہندوستان کی نیشنل فزیکل لیباریٹری اور اقوام متحدہ کی ایک ایجنسی نے مل کر ایک سولر کوکر بنا ہی لیا اور اب ہندوستانی گھرانوں میں اس کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔ ایک قسم کے کوکر میں عکسی آئینہ ہے اور ایک پریشر کوکر دوسرے قسم کے کوکر میں چار چپٹے آئینے ہوتے ہیں اور ایک منفصل کیا ہوا حرارت یکجا کرنے کے لیے بکس جس میں گلوبر کا شفاف نمک بھرا ہوتا ہے۔ اس سے سورج غروب ہونے کے بعد بھی گرمی خارج ہوتی رہتی ہے۔

سوڈان اور مشرقی افریقہ میں ایک سادہ شمسی کوکر بہت مقبول ہوا ہے۔ اس میں ساڑھے چار فیٹ کا پھیلا ہوا المونیم کا موقعر عاکسہ ہوتا ہے۔ یہ سیدھے لوہے کے چھڑ پر لگا ہوتا ہے۔ سورج کی مرکوز شعاعیں تار کی جالی پر رکھے ایک برتن پر پڑتی ہیں۔ یہ تار کی جالی عاکسہ کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔

ایک اور اہم اختراع سولار اسٹل کی بھی ہے جس سے کھارے پانی کی تقطیر سے میٹھا پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ اسٹل نمک کے پانی کو رکھنے کے لیے برتن کے مثل ہوتی ہے جس پر ڈھلوان شیشے کی چھت ہوتی ہے۔ دھوپ کی شدت سے نمک کا پانی جب اڑتا ہے تو ابخرات شیشے کی حیثیت پر قطروں کے شکل یکجا ہوجاتے ہیں۔ یہ قطرے اچھے پانی کو ذخیرہ کرنے والے برتن میں پہنچ جاتے ہیں۔ نمک جو کہ پانی کے مثل اہم شے ہے برتن میں باقی رہ جاتا ہے۔

شمسی بھٹیاں ابھی تک تجربہ کی اسٹیج میں ہیں۔ اب تک تجرباتی مرحلات سے نہیں گزری ہے۔ فرانس کے ماہرین تحقیقی مقام پیرانیز میں ان بھٹیوں کو چلا رہے ہیں۔ یہ ساری بھٹیاں بہت بڑی ہیں۔ ان میں سے ایک کا رقبہ 43 مربعہ فیٹ ہے اور اس میں 516 عکسی شیشے لگے ہوئے ہیں۔ اس کے 80 فیٹ کے فاصلے پر ایک شیشہ کا پیرابولا ہے جو 31 فیٹ چوڑا اور 33 فیٹ لمبا ہے۔ اس نظام سے جو گرمی پیدا ہوتی ہے وہ فی گھنٹہ 130 پاؤنڈ لوہے کو پگھلا سکتی ہے۔ روسیوں نے ایک بہت بڑا "ہیلیو بائلر" بنایا ہے۔ یہ ایک 80 فیٹ اونچی مینار ہے جس کے چاروں طرف 23 ہم مرکز ریل کی پٹریاں ہیں۔ ان پٹریوں پر چلنے والے ڈبوں میں 16 فیٹ لمبا اور 10 فیٹ چوڑا عکسی شیشہ ہوتا ہے۔ ان شیشوں سے سورج کی شعاعیں مرکوز ہوکر مینار میں بائلر پر پڑتی ہیں۔ روسیوں نے دعوا کیا ہے کہ اس سے بیش حرارت والی بھاپ اس قدر پیدا ہوتی ہے کہ ایک ایسے چرخابی جنریٹر کو چلایا جاسکتا ہے جو 1000 کیلوواٹ بجلی پیدا کرتی ہے۔

سورج کی شعاعوں سے بجلی پیدا کرنے کا سب سے اچھا طریقہ "شمسی بیٹری" ہی معلوم ہوتی ہے۔ امریکہ کے بل تجربہ گاہوں کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے 1954 میں پہلی بار ایسی بیٹری کا مظاہرہ کیا۔ جس کو جرمنیم یا سلیکون سے بنے نیم موصل قلموں سے چلایا جاتا ہے (ٹرانسسٹر میں بھی ایک برقی رو پیدا ہوتی ہے۔ بل کی بنائی ہوئی ایک بیٹری جس میں 400 سلیکون خانے تھے 12 وولٹ کی برقی رو پیدا کرسکتی تھی۔ اُس پہلے مظاہرہ کے بعد سے اب تک شمسی بیٹری میں کافی ترقی ہوئی ہے اور اس کو انسان کی سب سے عظیم الشان مہم میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ سیارچوں اور ہوادار راکٹ بگھیوں کو خلا میں بھیجنے میں اس بیٹری سے کام لیا گیا ہے اور جوہری بیٹریاں اپنی طویل عمر کے باعث خلائی گاڑیوں کے ٹرانسسٹروں کو پاور فراہم کرنے کے لیے انتہائی کارآمد ہیں۔

رہائشی مکانوں میں یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ بیٹریاں کم وولٹیج کی برقی رو کو اپنی ترقی کے باعث فراہم کرنے کی اہل ہوجائیں گی۔ اس کی سب سے بہتر کارگزاری 22 فی صدی ہے جو کہ سلیکون کی فی مربع گز سطح سے 200 واٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت سے واضح ہے۔

فرانسیسی سائنس دانوں نے ایک شمسی لیمپ بھی بنایا ہے جو چھوٹے سوٹ کیس کے برابر ہے۔ اس کے اُوپر سورج کی توانائی کو جمع کرنے کے لیے درجنوں سلیکون کے سل لگے ہوئے ہیں جو روشنی سے بہت جلد متاثر ہوتے ہیں۔ اس طرح جمع کی ہوئی سورج کی توانائی کو ایک مخزن میں رکھا جاتا ہے۔ سوٹ کیس کے زیریں حصے میں ایک مختصر فلورنٹ ٹیوب ہوتا ہے۔ دن کے وقت اس آلہ کو سورج کی روشنی میں رکھ دیا جاتا ہے اور سورج غروب ہونے کے بعد اسے گھر کے اندر لے جاکر لیمپ کو بٹن دبا کر جلا لیتے ہیں۔ یہ آلہ جتنی دیر تک سورج کی روشنی میں رہتا ہے اتنی ہی دیر تک یہ لیمپ روشنی دیتا ہے۔

شمسی بیٹریوں میں نیم موصل کے بجائے تاب جگا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس میں مسئلہ یہ ہے کہ جب تاب جگا کا ایک سرا سورج کی روشنی میں

گرم ہوتا رہتا ہے تو دوسرے سرے کو کس طرح ٹھنڈا رکھا جائے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں برقی رو پیدا نہیں ہوتی ہے۔

برٹش نیشنل فیزیکل لیباریٹری کی سورج کی توانائی سے متعلق کمیٹی نے 1950 میں ایک ایسا مشورہ دیا جس سے گرم سیر خطوں میں متواتر توانائی مہیا ہوسکتی تھی۔ مشورہ یہ تھا کہ جنگلوں سے لکڑی حاصل کرنے کے لیے یوکلپٹس اور اس کے مثل تیز بڑھنے والے پیڑ لگائے جائیں اور اوسط درجے کے پاور اسٹیشن میں اس کو مستقل طور پر جلایا جائے۔ چند مربع میل کے علاقے میں لگے ہوئے یوکلپٹس کے درختوں سے حاضر لکڑی پیدا ہوگی۔ جس سے پاور اسٹیشن کے بائلروں کو ہمیشہ آگ ملتی رہے گی یہ سلسلہ نہ ختم ہونے والا ہوگا۔ ایک جانب لکڑی کا استعمال ہوگا تو دوسری طرف یہ کمی درختوں کے بڑھنے سے پوری ہوجائے گی۔

سورج کی توانائی کو یوکلپٹس کے ذریعے بجلی کی طاقت میں تبدیل کرنے کا یہ طریقہ شاید بہت زیادہ کارآمد نہ ہو لیکن اس سے ہمارے سائنس دانوں کی کاوشوں کا پتہ چلتا ہے اور یہ علم ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کو کیسی کیسی نئی راہوں اور توانائی کے حصول کے ذریعوں سے روشناس کرایا ہے تا کہ معیار زندگی بلند ہوسکے۔ گزرے ہوئے دنوں میں کسی بھی قوم کی تہذیب کے معیار کا پیمانہ یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک سال میں کتنے پاؤنڈ صابن استعمال کرتا ہے۔ آج اس معیار کا پیمانہ یہ ہے کہ ہر کسی کو کتنے اسپی طاقت یا کتنے کیلوواٹ فی گھنٹہ بجلی فراہم کی جاتی ہے۔ کیا یہ ہماری ترقی کی عمدہ مثال نہیں؟ آج مغربی دنیا کو پچھڑے ہوئے افریقی اور ایشیائی ملکوں کے مقابلے میں چالیس سے اسی گنا زیادہ توانائی مہیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی دنیا کے باشندوں کو چالیس سے اسی گنا زیادہ خوراک، مکان، کپڑے اور بہتر صحت اور نقل وحمل کی سہولتیں مہیا ہیں۔ الغرض ہر وہ چیز جس کی روزمرہ زندگی میں ضرورت ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جسے پیدا کرتے ہیں یا استعمال کرتے ہیں یا بیرون ممالک کی اشیا یا خدمات سے تبدیل کرتے ہیں مغربی قوموں کو فوقیت حاصل ہے۔

آج ہمارے پاس ایسے تکنیکی ذریعے موجود ہیں جس سے کافی توانائی پیدا کرکے ساری دنیا کے معیار زندگی کو بلند کرکے اس درجے تک پہنچایا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ آسودہ وخوش خرم زندگی گزار سکیں۔ ہمارا یہ اولین فرض ہے کہ اس صدی کا جو کچھ بھی حصہ بچ رہا ہے اس میں ہر ممکن کوشش کریں کہ کوئی بھی شخص دنیا کے کسی کونے میں بھوکا اور ننگا نہ رہنے پائے۔

□□□

عبدالحلیم شرر — بحیثیت ناول نگار

مصنف: علی احمد فاطمی

اس کتاب میں مصنف نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے شرر سے قبل کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کے جائزے میں شرر کے حالات زندگی، خاندانی پس منظر، ملازمتوں اور علمی مشاغل، سفر انگلستان اور قیام حیدرآباد نیز ان کی بعض اہم تحریروں کی اولین اشاعت جیسے امور سے تفصیلی بحث کی ہے۔

صفحات: 393، قیمت -/165 روپے

غزل اور غزل کی تعلیم

مصنف: اختر انصاری

اختر انصاری کی یہ کتاب غزل کی تعلیم کے دوران پیش آنے والے مسائل سے بحث کرتی ہے جس میں اردو غزل کے تاریخی وادبی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو غزل کی ہیئت ومقبولیت، اس کے فنی محاسن، غزل کی تنقید اور بتدریج ارتقائی سفر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہ طور خاص درس وتدریس سے وابستہ افراد کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 231، قیمت -/66 روپے

غازی حمید اللہ خاں

(ہماری مطبوعات سے)

کلاسیکی تامل شلوک

تامل ہندوستان کی ایک قدیم زبان ہے۔ ماہرینِ لسانیات اسے دنیا کی دوسری قدیم زبانوں مثلاً سنسکرت، یونانی، لاطینی، فارسی اور عربی کا ہم پلہ وہم رتبہ قرار دیتے ہیں۔ تاریخی کتبات اور دوسرے شواہد بھی اس کی قدامت کو ثابت کرتے ہیں۔ آج بھی یہ زبان جنوبی ہندوستان کے وسیع علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ریاست تامل ناڈو میں اسے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

تامل زبان میں کئی کتابیں ایسی ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہزاروں سال پرانی ہیں، نالاڈیار کے متعلق بھی ایسا ہی دعویٰ کیا جاتا ہے۔

وہ قدیم تامل کتابیں جن کی ادبی حیثیت مُسلّم ہے 36 ہیں اور انھیں دو حصوں میں بانٹا گیا ہے "پَت پاٹ، اور ایٹ توگھئی، قدیم ترین 18 کتابوں پر مشتمل ہیں، اِن کو مَیل کنک، کہتے ہیں، اسی طرح باقی 18 کتابوں کو مجموعی طور پر کیٹز کنک کہتے ہیں اور یہ میل کنک سے کچھ بعد کی ہیں۔ نالاڈیار کو کیٹز کنک میں شمار کیا جاتا ہے، تامل کی مشہور ترین کتاب تُرل بھی" کیٹز کنک" کتابوں میں سے ایک ہے۔ ان تمام قدیم ادبی شاہکاروں کی فہرست جو مندرجۂ ذیل ہیں، ایک تامل شلوک میں دی گئی ہے:

نالاڈیار نان منی، نال ناپدو، این دِنی، 'مپال (تُرل)' کنڈوکم، کودئی پڑموزی،

مامولم، کل وڑی، اِکا اِنی یَو ئی، تنی مالئی، مُد دموزی کانچی اوز ایلا دی۔

نالاڈیار کا نام اس میں ہے، اسی سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ ایک تامل شلوک میں تُرل اور نالاڈیار دونوں کو ہم پلہ قرار دیتے ہوئے اُن کی عظمت کا اس طرح اعتراف کیا گیا ہے "جس طرح بڑ اور نیم کے درختوں کی دَتون سے دانتوں کو طاقت ملتی ہے اسی طرح نالاڈیار اور تُرل کے شلوکوں کا حوالہ دینے سے بات زیادہ قابل قبول ہو جاتی ہے۔"

نالاڈیار کے متعلق ایک نہایت ہی دلچسپ قِصّہ مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں مدورا کے شمال میں قحط پڑا تھا لہٰذا وہاں کے باکمال آدمی مدورا آکر بس گئے تھے، مقامی راجا کو ان کی عالمانہ صحبت اس قدر پسند آئی کہ جب کچھ عرصے بعد انھوں نے وطن جانے کا خیال ظاہر کیا تو اسے بہت رنج ہوا اور اس نے انھیں مدورا چھوڑنے کی اجازت نہ دی لہٰذا وہ لوگ راجا کے ڈر سے رات کے اندھیرے میں مدورا سے بھاگ نکلے۔ جاتے وقت اُن میں سے ہر ایک تاڑ کے پتوں پر ایک ایک شلوک لِکھ کر چھوڑ گیا۔ اگلی صبح جب راجا کو اُن کے چلے جانے کا علم ہوا تو اُس نے وہ تمام تاڑ پتر منگوائے اور اُنھیں مقامی دریا ویگئی میں ڈال دینے کا حکم دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے 400 تاڑ پتر دریا کے دھارے کے بہاؤ کے خلاف بجائے نیچے کی طرف بہنے کے اُوپر کی طرف بہنے لگے اور ایک جگہ کنارے سے لگ گئے۔ انھیں پھر راجا کے سامنے پیش کیا گیا۔ اسی مجموعے کو نالاڈیار کہتے ہیں۔ اس کہانی میں سچائی کس حد تک ہے یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ ایک بات البتہ ظاہر ہے کہ یہ 400 شلوک تامل ادب عالیہ میں اتنا بلند مقام رکھتے ہیں کہ زمانے کے تھپیڑوں نے بھی انھیں برباد نہ کیا اور اہلِ علم و دانش نے انھیں ہمیشہ یاد رکھا اور اِن کا درس دیا۔ نالاڈیار کو "ویلالرویدم" بھی کہتے ہیں یعنی "مقامی آدمیوں کا وید۔"

نالاڈیار کو ایک مشہور تامل عالم پدُ ومنار نے ترتیب دیا اور اِس کے شلوکوں کو تُرل کی طرح مختلف سُرخیوں کے تحت یکجا کر کے سارے مجموعے کو تین حِصّوں میں تقسیم کیا۔ پدُ ومنار نے مجموعے کے شروع میں خود اپنا ایک شلوک بھی شامل کیا ہے جس میں مالکِ حقیقی کی حمد و ثنا کی گئی ہے۔

نالاڈیار چار سو شلوکوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے اِسے تامل میں اکثر نالاڈی۔ ناُوریا چار سو شلوک کہتے ہیں۔ تامل زبان میں "نالاڈیار" لفظ کا مطلب بھی چار مصرعوں والا شلوک ہے۔ ظاہر ہے کہ قدیم زمانے میں شلوکوں کا اِس سے بہتر مجموعہ تامل زبان میں نہیں تھا۔ یہ شلوک ایک گلدستہ ہیں اور اس میں بہت سے شاعروں کا کلام شامل ہے جن کے نام تک کسی کو معلوم نہیں۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ یہ شلوک جَین شعرا کے تصنیف کردہ ہیں۔ کٹیو سوامی مُدلیار، ڈاکٹر وردراجنار دونوں کا یہی خیال ہے۔ پوپ کی بھی یہی رائے ہے لیکن اُس کا کہنا ہے کہ سب شلوک شاید جَین شعرا کے نہ ہوں۔

"نالاڈیار (کلاسیکی تامل شلوکوں کا مجموعہ)" سے ماخوذ، مترجم: غازی حمیداللہ خاں، صفحات 83، قیمت: 41/-

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

اِن شلوکوں میں جو مضامین نظم کیے گئے ہیں وہ سب اخلاقیات سے متعلق ہیں اگر چہ کہیں کہیں ہجر و فراق کا ذکر بھی آگیا ہے۔ ان میں انسانی جسم کی ناپائداری، ترکِ علائق، گذشتہ اعمال کا پھل، صبر کی تلقین، اِنکساری، سخاوت، قرابت داروں کے ساتھ سلوک، استقلال اور دانشمندی اور دوسرے اخلاقی موضوعات کا بیان ملتا ہے۔ اِستعارے اور تشبیہات مقامی رنگ لیے ہوئے ہیں۔

یہ ترجمہ میں نے براہِ راست تامل سے کیا ہے۔ اس کتاب کی شرحیں بھی دیکھی ہیں اور جہاں کہیں شارحین میں اختلافِ رائے نظر آیا تو ان پر خود غور کیا ہے۔ اِس ترجمہ کے سلسلے میں اِی۔ را۔ سُبر امنیم پلّے، مرحوم وی۔ ایس سُبیا، ڈاکٹر وجے لکشمی اور ڈاکٹر چوپڑا نے میری بہت ہمت افزائی کی۔ محترمی حبیب الرحمٰن صدیقی مرحوم نے پہلے 26 شلوکوں کا ترجمہ دیکھا اور اس سلسلے میں مجھے مفید مشورے دیے۔ برادرم محمد مجاہد اللہ خاں نے بھی اس کام میں میری مدد کی ہے سب سے زیادہ مدد مجھے والدِ محترم سے ملی تھی۔ والد محترم محمد سعد اللہ خاں صاحب مرحوم نے اِن شلوکوں کے ترجمے کو دیکھا اور اِن پر نظرِ ثانی کی اور بہت سے مفید مشورے دیے۔ الفاظ، محاورات، تشبیہات اور استعارے، جُملوں کی تراکیب، غرض ہر طرح والد مرحوم نے اِن شلوکوں کے سلسلے میری رہبری کی۔ اگر انھوں نے ہر قدم پر میری ہمت افزائی نہ کی ہوتی تو یہ کام کبھی تکمیل کو نہ پہنچتا۔

بہر حال میری یہ محنت کہاں تک پذیرائی کے قابل ہے اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں۔

●

جن چیزوں کے متعلق تم یہ کہتے تھے کہ قائم رہیں گی قائم نہ رہ سکیں، لہٰذا جن جن کاموں کو ضروری سمجھتے ہو فوراً کر ڈالو کہ موت تیزی سے تمھارے تعاقب میں چلی آرہی ہے۔

●

زندگی کے دن مقرر ہیں اور ان میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ موت سے چھٹکارا پانے والے اُس سے بچنے والے یا اُسے فریب دینے والے یہاں نہیں ہیں۔ دولت کے بڑے ذخیرے جمع نہ کرو بلکہ خیرات کر ڈالو کیونکہ کل جنازے کا باجہ بجنے والا ہے۔

●

کوتاہ اندیش دولت مند یہ کہتے ہیں کہ ہم امیر ہیں لیکن انجام پر نظر نہیں رکھتے۔ اُن کی کثیر دولت کی مثال اُس بجلی جیسی ہے جو اندھیری رات میں کسی سیاہ بادل کے دامن سے نکل کر آناً فاناً غائب ہو جائے۔

●

وہ نہ خود کھاتا ہے اور نہ دوسروں کو فیض پہنچاتا ہے نہ کوئی قابلِ تعریف کام کرتا ہے اور نہ اپنے نادار دوستوں کی تکلیفوں کو دور کرتا ہے کچھ خرچ نہیں کرتا بس دولت کی رکھوالی کرتا رہتا ہے۔ افسوس! (اس کے بارے میں) یہی کہا جائے گا کہ اس کی زندگی رائیگاں گئی۔

●

جو لوگ نہ اچھا کھاتے ہیں اور نہ اچھا پہنتے ہیں، خود اپنے جسم کو ہی تکلیف دیتے ہیں کیونکہ اگر وہ کوئی ایسا نیک کام نہیں کرتے جو ثواب جاریہ کا حکم رکھتا ہو تو وہ برباد ہونے والوں میں سے ہیں۔ اے فلک بوس چوٹیوں کے مالک! یہ ایسا ہے کہ جیسے شہد کی مکھیاں شہد ہی جمع کرتی رہیں!

●

میری ماں مجھے یہاں چھوڑ کر خود اپنی ماں کی تلاش میں چلی گئی جس طرح کہ اس کی ماں اپنی ماں کی تلاش میں جا چکی تھی۔ تلاشِ مادراں کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور حاصل دُنیا بھی یہی ہے!

●

ایک بکری کا بچہ، قصائی کے ہاتھ سے خوشبودار ہار کی نازک پتیاں اُچھلتے کودتے ہوئے بڑے شوق سے کھائے گا، لیکن دانشمندوں کے پاس ایسی ناپائدار خوشی نہ ملے گی۔

●

تمھاری زندگی کے دنوں کو شمار کرنے کے لیے مہرِ درخشاں بلاناغہ ہر روز طلوع ہوتا ہے لہٰذا قبل اس کے کہ تمھاری زندگی کے دن پورے ہو جائیں نیک کام کر ڈالو کیونکہ اس زمین پر ثبات کسی کو نہیں۔

●

یہ سوچ کر کہ شبنم کے قطروں کی طرح یہ جسم بھی فانی ہے، ابھی، اِسی وقت نیک کام کر ڈالو، کیونکہ "وہ ابھی کھڑا ہوا تھا (پھر) بیٹھا (اور) گر پڑا اور اپنے عزیزوں کو روتا ہوا چھوڑ کر چل بسا۔" ایسا ہوتا بھی سنا ہے۔

●

رس نکالے ہوئے گنّے کے چھلکوں کے ڈھیر میں آگ لگانے کا کسی کو افسوس نہ ہوگا ایسے ہی جن لوگوں نے اپنی جد و جہد سے اس جسم کا پھل حاصل کر لیا ہے، موت کے آنے پر وہ بھی افسوس کرنے والوں میں سے نہ ہوں گے۔

●

بَڑ کے درخت کا ایک چھوٹا سا بیج بڑھ کر ایک زبردست سایہ دار درخت بن جاتا ہے اسی طرح نیکی خواہ کتنی ہی چھوٹی ہو اس کا پھل اگر معقول آدمیوں کے ہاتھ پڑ جائے تو سارے آسمان پر حاوی ہو سکتا ہے۔

•

وہ روزانہ، دن گزرتے دیکھتے ہیں مگر غور نہیں کرتے بلکہ فرطِ خوشی سے کہتے ہیں کہ (یہ) دن، تو دن ڈوبے تک ہمارے ساتھ رہے گا۔ روزانہ اپنی زندگی کے دنوں میں ایک دن کی کمی ہوتی جارہی ہے اِس کا خیال نہیں کرتے۔

•

جوانی یونہی بیکار گئی۔ اب بڑھاپا اور اس کے ساتھ آنے والی بیماریاں ہیں۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد، اے دل! مجھ سے بیکار بحث نہ کر۔ اُٹھ اور میرے ساتھ نکل چل۔ جہاں ہم دونوں کو نیک راستہ مل جائے، کیا تو ایسی جگہ بھی نہ چلے گا؟

•

جب ایسی مصیبتیں سر پر آئیں کہ ان کا مقابلہ محال ہو اور جو ایسے نیک کاموں میں حارج ہوں جن کا کرنے کا فیصلہ، عالی حوصلہ آدمیوں نے کیا ہو تو جو لوگ مصائب کا خیال نہ کرتے ہوئے نہایت ثابت قدمی سے اعلیٰ اصولوں کی پابندی میں لگے رہتے ہیں وہی فلاح پانے والے ہیں۔

•

نوجوانوں کا تحمل ہی اصل تحمل ہے۔ جن کے پاس دولت کے ذخیرے نہ ہوں اُن کا دیا ہوا ہی اصل تحفہ ہے جس میں ہر شخص کو سزا دینے کی طاقت ہو، اس کا صبر کرلینا ہی دراصل صبر ہے۔

•

ایسے آدمی تو اس دنیا میں کہیں بھی نہ ملیں گے جو یہ دیکھ کر کہ ایک پاگل کتے نے انھیں کاٹ لیا ہے خود اپنے منہ سے اُس پاگل کتے کو کاٹنے لگیں۔ اسی طرح جب ذلیل آدمی اپنے منہ سے نازیبا الفاظ نکالتے ہیں تو کیا عالی رُتبہ آدمی، انتقاماً خود اپنے مُنہ سے ایسے ہی نازیبا الفاظ ادا کریں گے؟

•

ہمدرد دوستوں کے منہ سے نکلے ہوئے سخت الفاظ انجام و نتائج کے پیش نظر غیروں کے تصنع آمیز میٹھے بولوں سے بہتر ہوتے ہیں۔

•

جب دو آدمی دوستی کے رشتے میں منسلک ہوجائیں کہ باہمی اختلافات نہ رہیں اور بعد میں کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک شخص سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوجائے تو دوسرے کو چاہیے کہ حتی الامکان اسے نظرانداز کرے اور جب برداشت نہ کرسکے تو بھی اس کی تشہیر نہ کرے بلکہ خود ایسی باتوں سے دور ہی رہے۔

•

چاہے تمھیں خود نقصان اُٹھانا پڑے پھر بھی دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لیے نہ سوچو۔ اگر تمھارا جسم کمزور ہوجائے تو بھی کسی نالائق کے ہاتھوں کا دیا ہوا نہ کھاؤ۔ اگر تمھیں وہ ساری زمین مل جائے جس پر آسمان چھایا ہوا ہے تو بھی سچ میں جھوٹ ملا کر کوئی بات نہ کہو۔

□□□

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاقی، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھکتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب ولہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔ ''انیس کے سلام'' مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت-/60 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کا شمار اردو کے اہم جدید نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ''نئی شعری روایت'' نے اردو میں جدیدیت کی بنیادیں مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ کتاب تین مستقل ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب بعنوان بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور اس کے مضمرات لکھا گیا ہے، دوسرا باب نئی جمالیات اور تخلیقی عمل ہے اور تیسرا اظہار و ابلاغ کے مسائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔

صفحات: 240، قیمت-/127 روپے

یو این آئی اردو سروس

قومی اردو کونسل ہندوستان کے ان اخبارات کو جن کی تعداد اشاعت 25ہزار یا اس سے کم ہے اور وہ تازہ ترین خبروں کے لیے یو این آئی اردو سروس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں، اس سروس کی فراہمی پر انے والے اخراجات کا 50% بطور سبسڈی ادا کرتی ہے۔ جموں و کشمیر کے اخبارات کے لیے یہ شرح 75% فیصد رکھی گئی ہے۔ اس مد میں قومی اردو کونسل نے اس اسکیم کے اغاز سے اب تک جو رقم خرچ کی ہے اس کی تفصیل اس طرح ہے:

S.No.	Year	Urdu News Papers	Grant
1.	1996-1997	29	Rs. 1,33,839/-
2.	1997-1998	30	Rs. 10,51,290/-
3.	1998-1999	33	Rs. 16,53,360/-
4.	1999-2000	38	Rs. 3,16,800/-
5.	2000-2001	39	Rs. 11,32,608/-
6.	2001-2002	45	Rs. 34,23,909/-
7.	2002-2003	45	Rs. 22,82,611/-
8.	2003-2004	47	Rs. 22,86,611/-
9.	2004-2005	49	Rs. 21,98,237/-
10.	2005-2006	53	Rs. 23,52,658/-
11.	2006-2007	60	Rs. 48,25,113/-
12.	2007-2008	66	Rs. 23,41,086/-
13.	2008-2009	66	Rs. 23,49,895/-
14.	April 2009-September 2009	68	Rs. 12,51,065/-
	TOTAL		**Rs. 2,75,99,053/-**

پچھلے دنوں کونسل نے ان 68 اخبارات کے مالکان سے جو اس اسکیم سے استفادہ کررہے ہیں، اسکیم کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی تھی۔ ہمیں جو جوابات موصول ہوئے وہ ذیل میں درج کیے جارہے ہیں۔

- **احمد سعید ملیح آبادی، (ایڈیٹر آزاد ہند)، 183، سادرن ایونیو، نئی دہلی**

فروغ اردو کونسل میں ڈائرکٹر کی ذمے داریاں دوبارہ سنبھالنے کی مبارکباد، یو این آئی کی اردو نیوز سروس ٹھیک چل رہی ہے جس سے اردو اخبارات کی ایک ضرورت پوری ہوئی ہے۔ اس کو اور بہتر بنانے کے لیے وزارت انسانی وسائل کو بھرپور مدد کرنا چاہیے۔ یو این آئی والوں کے ساتھ میٹنگ کرکے طے کیا جائے کہ اس اردو نیوز سروس کو ترقی دینے کے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں۔

اردو نیوز سروس میں خبریں زیادہ تر ترجمہ ہوتی ہیں، ترجمے کا معیار بڑھانا بہت ضروری ہے۔ اہم خبروں کی اس قدر تلخیص نہ کی جائے کہ خبر مبہم اور نامکمل لگے خبروں کی کمپوزنگ کے بعد پروف پڑھنا ضروری ہے، کافی غلطیاں ہوتی ہیں جنھیں اخبارات کے دفاتر میں لفظ لفظ پڑھ کر درست کرنا پڑتا ہے۔ اب خبریں سیٹلائیٹ کے ذریعے ترسیل ہوتی ہیں، اس سسٹم میں اکثر رخنہ پڑتا ہے۔ خبریں پیسٹ کرانے کے لیے بہت وقت ہوتی ہے، یو این آئی کے دفتر میں اردو نیوز سروس کی ترسیل کا بندوبست درست کرنے کی ضرورت ہے۔

خبروں کی تعداد بڑھائی جائے بار ہا خبریں اتنی کم اور اختصار سے آتی ہیں کہ صفحات پورے کرنا مشکل ہوتا ہے۔

مذکورہ امور پر یو این آئی کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا جائے۔

■ **عسکر رضا، نیوز ایڈیٹر، روزنامہ سیاست، بنگلور**

یو این آئی اردو نیوز سروس کے متعلق جانکاری مہیا کرنے کی مہم خوش آئند ہے۔ روزنامہ ''سیاست'' بنگلور کے عملے نے اس موضوع پر غور وخوض کے بعد درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔

(1) یو این آئی اردو نیوز سروس کسی حد تک سست سروس ہے۔

(2) اسپورٹس خصوصیت سے فٹ بال اور ہاکی کے قومی مقابلوں کا کوریج بالکل نہیں ہوتا۔

(3) گزشتہ 3 ماہ سے املا کی بہت غلطیاں ہیں ٹائپسٹ ایک لفظ کے بعد ''اسپیس'' نہیں دیتا جس کی وجہ سے دو لفظ مل جاتے ہیں۔

(4) مسلم دلچسپی کی خبریں اچھی ہوتی ہیں۔

مشورہ: اگر اردو روزناموں کو یو این آئی فوٹو اور فیچر (انگریزی میں بھی ہو تو بھی) سبسیڈی نرخ پر مہیا کی جائیں تو اردو اخبارات کا معیار قدرے بہتر ہوسکتا ہے۔

■ **محمد زکی (ایڈیٹر ''مشرقی آواز'' اردو روزنامہ دہلی اور گورکھپور، 1739/55، تائی والا، کرول باغ، نئی دہلی-110005**

آپ کا خط ملا۔ اردو اخبارات پر توجہ دینے کے لیے شکریہ، آپ نے یو این آئی اردو سروس کے بارے میں ہماری رائے طلب کی ہے، ''مشرقی آواز'' نے 1992 میں یو این آئی اردو سروس شروع ہونے کے بعد سب سے پہلے یہ سروس ہندی اور انگریزی کے مقابلے کافی کمزور ہونے کے باوجود یہ سوچ کر لی تھی کہ آگے چل کر یہ سروس بہتر ہو جائے گی، لیکن افسوس کہ یہ آج بھی یو این آئی کی ہی ہندی اور انگریزی خدمات کے مقابلے میں کافی پیچھے ہے اور پیچھے رہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سروس مکمل طور پر ہندی اور انگریزی کے ترجمے پر منحصر ہے، براہ کرم ہماری ان تجاویز پر توجہ دیں۔

- یو این آئی اردو سروس کے نمائندے اس طرح جگہ جگہ نہیں ہیں جس طرح ہندی اور انگریزی کے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہندی اور انگریزی سے ترجمے کے چکر میں اہم خبریں بھی کافی دیر سے آتی ہیں اور اکثر وہ شائع نہیں ہو پاتی ہیں۔ ہماری سمجھ سے یہ اس سروس کی بہت بڑی کمی ہے اور یہ کمی دور کی جانی چاہیے۔
- یو این آئی اردو سروس اتنی خبریں دینے سے معذور ہے کہ کم از کم ایک آٹھ صفحے کا اخبار مکمل ہو جائے۔ خبروں کے ساتھ حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی ہو تو اردو اخبارات کا معیار بڑھنے کے ساتھ خبروں کی کمی کا شکوہ بھی دور ہو جائے۔
- اردو سروس میں دہلی کی مقامی خبریں نہیں کے برابر ہوتی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی خبروں کی بھیڑ لگی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کئی بار اہم مقامی خبریں چھوٹ جاتی ہیں کیوں کہ اردو اخبارات کے پاس بہت محدود وسائل ہیں۔ مقامی خبریں زیادہ سے زیادہ ہوں، اس کا انتظام کیا جائے۔
- اردو اخبارات کے قارئین کے مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے عالم اسلام اور مسلمانوں سے منسلک خبریں زیادہ سے زیادہ جاری کی جائیں۔
- ادھر کچھ مہینوں سے کمپوزنگ بہت بیکار ہے۔ اکثر حروف ملے ہوتے ہیں جس سے خبریں پڑھنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کمپوزنگ بہتر ہونی چاہیے، کمپوزنگ کے بعد اگر خبر پڑھ لی جائے تو شاید ایسا نہ ہو۔

■ **ایس ایم حنیف احسن، ایگزیکٹیو ایڈیٹر ''پرتاپ'' پرتاپ بھون، 5 بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی-110002**

یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ آپ جیسے محسن اردو کو دوبارہ اس ادارے کا ڈائرکٹر بنایا گیا ہے۔ اردو کے لیے آپ کے دل میں جو جذبہ ہے وہ آپ کے زیر نظر خط سے ہی واضح ہے۔

آپ نے یو این آئی اردو سروس کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے سلسلے میں ہماری رائے مانگی ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات آپ کی توجہ کے مستحق ہیں۔

1. یو این آئی کی فوٹو سروس بھی اردو اخبارات کو امدادی قیمت پر دلانے کی طرف قومی کونسل کو توجہ دینی چاہیے۔
2. یو این آئی کی اردو سروس انگلش سروس کی ''ٹرانسلیشن ایجنسی'' سے زیادہ کچھ نہیں رہ گئی ہے۔ اس کو اپنے آپ میں مکمل سروس بنانے کے لیے پورے ملک میں اور خاص کر ان اضلاع میں جہاں پر اردو زیادہ پڑھی اور بولی جاتی ہے جز وقتی رپورٹر رکھے جانے چاہئیں جو کہ اردو میں خبریں یو این آئی اردو کو دیں۔ اس سے اردو کی مزید خدمت ہوگی اور پورے ملک میں ہزاروں لوگ براہ راست اس اردو سروس سے جڑ جائیں گے۔ قومی کونسل، ایسے جز وقتی رپورٹروں کو اپنی طرف سے ایک کمپیوٹر مہیا کرانے کے ساتھ ہی ساتھ ہر ماہ اعزازیہ بھی دے سکتی ہے۔
3. قومی کونسل کو اردو کے فروغ کے لیے مختلف اداروں سے اردو صحافتی کورس کرنے والے طالب علموں کو اردو اخبارات میں تربیت کے لیے چھ مہینے

سے لے کر ایک سال تک کے لیے اسٹائپنڈ بھی دینا چاہیے۔ جس سے کہ نئے اردو صحافیوں کی ہمت افزائی ہو۔

ہمیں امید ہے کہ آپ بھی پالیسی بناتے وقت مندرجہ بالا نکات پر دھیان دیں گے۔

■ **امتیاز الدین، مدیر "سیاسی افق"، G-10/10-D، علامہ اقبال روڈ، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025**

آپ کا خط موصول ہوا جس میں آپ نے یو این آئی اردو سروس کی خدمات کے بارے میں ہماری رائے جاننا چاہی ہے تاکہ اس سروس کی کارکردگی کو اور بہتر بنایا جاسکے، کچھ ٹھوس تجاویز آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

1. اردو سروس کے نمائندوں میں اضافے کی ضرورت ہے تاکہ تازہ خبریں جلد موصول ہو سکیں۔
2. خبروں یں پروف ریڈنگ کی کافی ضرورت ہے۔
3. کوئی بڑا حادثہ، واردات یا حالات حاضرہ سے متعلق خبر ہونے پر جب یو این آئی سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہمیں فلاں واردات کی خبر نہیں مل پا رہی ہے تو یو این آئی ایڈیٹر صحیح جواب نہیں دیتے ہیں اس لیے ادارے کو جواب دہ بنائے جانے کی ضرورت ہے۔
4. خبر رسانی بے حد سست ہے۔ دن کی خبر دیر شام تک بھی نہیں آپاتی اس کے لیے کئی بار فون کرنا پڑتا ہے۔
5. اردو اخباروں کو کچھ حد تک فوٹو بھی فراہم کرائے جائیں۔ (خاص کر مسلم اداروں کی) کیونکہ یہ فوٹو عموماً ہندی اور انگریزی کے اخباروں میں شائع نہیں ہوتی ہیں۔
6. خلیجی ممالک کے بجائے مقامی خبروں پر خاص توجہ دی جائے۔
7. مقامی خبروں (خاص کر دہلی) کا بحران رہتا ہے۔
8. اقلیتی اداروں کی خبروں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔
9. خبروں کی تعداد بیحد کم اور کبھی کبھی تو خبریں کئی کئی بار دہرائی ہوئی ہوتی ہے۔

■ **زبیر احمد فاروقی، مدیر اعلیٰ "انوار قوم"، 89/298، غربت اللہ پارک، ڈپٹی کا پڑاؤ، کانپور-208003**

میں تو یو این آئی اردو سروس کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اپنی ہندی سروس "یونیوارتا" اور انگریزی یو این آئی کی طرح اپنی اردو سروس کو Prompt اور بروقت کردیں تو اردو اخبارات کو بہت فائدہ ہوجائے گا۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہندی اور انگریزی سروس کے Despatches کے مقابلے میں اردو سروس کے Despatches ڈیڑھ دو گھنٹے تاخیر سے Email کیے جاتے ہیں اگر Event آٹھ بجے شام کا ہے تو ہندی اور انگریزی سروس اس کو 8-15 تک Flash کردے گی لیکن اردو سروس کو اس Event کو Flash کرنے میں ساڑھے نو یا رات کے دس بج جائیں گے اور اگر دس بجے رات کا Event ہے تو پھر اردو سروس پر کتنے بجے Flash ہوگا اس کو تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔

2. اردو سروس اور پھر املا کی غلطیاں۔ زبان کا مذاق اڑ جاتا ہے۔ اگر کمپیوٹر آپریٹر اور ڈیسک پر کام کرنے والا ایڈیٹر توجہ نہ دے تو اخبار اغلاط کا پلندہ ہوتا ہے۔ اس سے زبان کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

3. ٹائپ کرنے والے عام طور پر ٹائپ کرتے جاتے ہیں او رکمپیوٹر اسکرین پر اپنے ٹائپ کیے ہوئے الفاظ کو نہیں دیکھتے۔ جس کے نتیجے میں ایک لفظ دوسرے لفظ سے مل جاتا ہے جس میں کام صرف key board پر Space پر انگلی مارنے کا ہوتا ہے۔

یہ چند باتیں لائق اصلاح ہیں اگر ان پر توجہ دی جائے تو سروس آج سے بہتر ہوجائے گی۔ بصورت دیگر اردو والے اپنا سر دھنتے ہیں اور کام کرتے ہیں کہ اخبار تو بازار میں بھیجنا ہی ہے۔

■ **ایم ایس سرتاج، مدیر اعلیٰ روزنامہ راہ منزل، جے ایم سی-16، طلب کھٹکا، جموں-180001**

یو این آئی اردو نیوز سروس نہایت ہی پیچیدہ شکل میں پیش کی جارہی ہے جس کی وجہ سے ہم اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں کر پارہے ہیں۔ اس کو ایک خبر کی شکل میں لانے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم اس کا استعمال نہیں کر پارہے ہیں۔

یو این آئی اردو نیوز سروسز کو جاری رکھنے اور اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے اس کو آسان بنانا نہایت ضروری ہے۔ جیسے کہ دوسری اردو نیوز سروسز ہمیں خبریں فراہم کرتی ہیں۔ وہ ہم کو سیدھے اردو یعنی کہ (Inpage) میں خبریں ارسال (Mail) کرتی ہیں۔ جن کو ہم آسانی سے وقت ضائع کیے بغیر اخبار کے صفحے پر مناسب جگہ پر لگاتے ہیں اس کے برعکس یو این آئی اردو نیوز سروسز کی خبریں پہلے ایک بکس میں ارسال (mail) کی جاتی ہیں۔ جن کو ڈاؤن لوڈ کرنے کے بعد پہلے بکس سے الگ فولڈر میں لانا پڑتا ہے پھر ایک مخصوص سافٹ ویئر سے ان کو اردو یعنی Inpage میں لایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اخبار کے صفحے پر لگانے کے قابل بن پاتی ہیں۔ اس مشکل طریقے کو اختیار کرنے کے بجائے ہم دوسری اردو سروسز کو ترجیح دیتے ہیں۔ جن کی خبریں میل سے ڈاؤن لوڈ کرتے ہی استعمال کے قابل ہوتی ہیں۔ دوسری بڑی وجہ یو این آئی اردو نیوز سروسز کا باقی اردو سروسز کے مقابلے میں بہت زیادہ مہنگا ہونا بھی ہے۔

میں اس وقت یو این آئی اردو نیوز سروسز کے علاوہ 7 اور اردو سروسز حاصل کر رہا ہوں اور کسی بھی سروس کا (Rs. 500) پانچ سو روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ چونکہ دیگر اخبارات کی طرح اردو اخبارات کے وسائل زیادہ نہیں ہیں جو یہ مہنگی یو این آئی اردو نیوز سروسز حاصل کرسکیں۔ اس لیے یو این آئی اردو نیوز سروسز کو جس قدر زیادہ مالی امداد دی جائے بہتر ہوگا۔ تاکہ وہ اس سروس میں بہتری لاسکے اور اردو اخبارات کو کم اُجرت میں یو این آئی اردو نیوز سروسز فراہم کرسکیں۔

■ ایڈیٹر آواز ملک، 52/82، سہکاری بھون، ندیسر، وارانسی-221002

یو این آئی اردو سروس کے بارے میں میری رائے ہے کہ وہ نیشنل نیوز دستیاب کرانے میں دیگر ایجنسیوں کی نسبت قدرے کمزور ہے، اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ریاستی ہیڈ کوارٹروں خصوصاً اترپردیش حکومت کے فیصلوں کے بارے میں ضروری خبروں کو بھی تیزی سے پہنچانے میں ناکام ہے۔ یو این آئی کا اپنا کوئی اردو ویب سائٹ نہیں ہے، وہ اخبارات کے میل پر ہی خبریں بھیجتی ہے۔ مسلم بیٹ کی بھی خبریں کم ہوتی ہیں۔

■ ڈاکٹر ایس. ڈی. خان، ایڈیٹر "سو بھارتی" این. ایچ. -58، دہلی ہری دوار بائی پاس، سو بھارتی پورم، میرٹھ-250103

آپ کا ارسال کردہ مکتوب ملا۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ آپ کا ادارہ اردو اخبارات کی بہبود و ترقی کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ یو این آئی اردو سروسز سے وابستہ اردو اخبارات کو سبسڈی فراہم کرنا یقیناً ایک قابل ستائش قدم ہے۔ خصوصاً ان اردو اخبارات کے لیے جو اپنے محدود ذرائع کے ساتھ اردو صحافت کے ذریعے اردو زبان و ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ "صبا پربھات" کے اس فہرست میں شامل ہونے پر ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔

یو این آئی کی اردو سروس کے ذریعے دوسری مد مقابل سروسز کی طرح خبریں بروقت اور مزید تیز رفتاری کے ساتھ فراہم کی جاسکیں اس سمت میں جو بھی معاون قدم ہو اٹھایا جائے۔

■ وجیہہ احمد اندرابی، چیف ایڈیٹر "اطلاعات" دوسری منزل، الحبیب پلازہ، ایم. اے. لنک روڈ، سرینگر، جموں اینڈ کشمیر-190001

آپ کا خط ملا، جس میں آپ نے یو این آئی اردو سروس کے بارے میں رائے طلب کی ہے۔ اس سلسلے میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یو این آئی کی اردو سروس مناسب ہے۔ جن اردو اخبارات کے پاس زیادہ وسائل نہیں ان کے لیے یہ سروس غنیمت ہے۔

■ ایم. ایف. قادری، ایڈیٹر انچیف روزنامہ "محشر ڈیلی"، 22-8-405#، پہلی منزل، پہلی بلڈنگ، پرانی حویلی، ایکس روڈ، ترپولی کورٹ، حیدرآباد-500002 اے. پی.

آپ کا روانہ کردہ خط وصول ہوا۔ کونسل کی جانب سے اردو کے فروغ کے لیے اور اردو اخبارات کی ہمہ جہتی ترقی کے سلسلے میں جو گراں قدر تعاون مل رہا ہے وہ قابل قدر ہے اور قوی امید ہے کہ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔ ملک سے شائع ہونے والے چھوٹے اور متوسط اخبارات بھی آج ملک کے بیشتر قومی اخبارات کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں اور اس میں مزید جدید انفرا اسٹرکچر سے آراستہ کیا جاکر یو این آئی کی خدمات کو مزید ترقی دی جاسکتی ہے۔

■ دلیس راج منظر، ایڈیٹر "ہمارا مقصد"، 349/A، پنجابی بازار، کوٹلہ مبارکپور، نئی دہلی-110003

آپ کا خط موصول ہوا جس میں ہم سے یو این آئی سروسز کے بارے میں ٹھوس تجاویز طلب کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ آج کے دور میں یو این آئی اردو سروسز اردو اخبارات کی ریڑھ کی ہڈی کا کام کر رہی ہے۔ اس لیے آپ کا ادارہ اس کی کارکردگی کو مزید بہتر بنانے کے لیے جو بھی قدم اٹھائے گا اس کا استقبال کیا جائے گا۔

■ اے. کے. احسانی، مینجنگ ڈائرکٹر "چندار"، چندار ہاؤس، سلطان گنج، پٹنہ

7 جولائی کا ارسال کردہ آپ کا محبت نامہ نظر نواز ہوا۔ اس کے جواب میں یہی کہنا ہے کہ یو این آئی اردو سروس نے پچھلے چند برسوں سے اپنی جو نمایاں کارکردگی نبھائی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ لیکن اس میں اصلاح کی مزید گنجائش باقی ہے اور اسے مزید فعال بنانے کے لیے جدوجہد بھی درکار ہے۔ یو این آئی کی زیادہ توجہ مشرقی وسطی ممالک کی سرگرمیوں پر رہتی ہے، وہ بھی خبریں عموماً ایک دن تاخیر سے ملتی ہیں، بہار پر قدرے کم توجہ دی جاتی ہے۔ بہار کی خبریں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں جبکہ بہار سے کئی اچھے اردو اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ایک اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس میں املے کی بھی غلطیاں بے شمار رہ جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر پہلے جو خبریں تسلسل سے موصول ہوتی تھیں اور وافر تعداد میں ہوا کرتی تھیں ان میں کمی آئی ہے۔

■ عبدالقدوس بستوی، ایڈیٹر روزنامہ "متاع آخرت"، 88/148-C، دالیل پوروہ، نزد بانس منڈی، پولیس چوکی، کانپور-208001

آپ کے زیر قیادت قومی کونسل نے اردو زبان کے فروغ اور ارتقا کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں انھوں نے زبان اردو میں نئی جان ڈال دی ہے جس کے لیے ارباب اقتدار کے ساتھ آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو کے فروغ اور بقا کے لیے ملک گیر پیمانے پر جو اسکیمیں چلائی ہیں وہ ثمر آور ثابت ہو رہی ہیں انھیں میں سے ایک منفعت بخش اسکیم "یو این آئی" کی اردو خبروں سے چھوٹے اخبارات

جرائد ورسائل کو سبسیڈی دے کر مستفید کراتا ہے۔ یقیناً یہ ایک مستحسن قدم ہے جس کو اردو صحافتی دنیا بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

جہاں تک ''یو این آئی'' کی اردو خبروں کے معیار اور ان کی معتبریت اور تازگی کا سوال ہے ''یو این آئی'' کی اردو خبریں ہر لحاظ سے معیاری اور بروقت ہوتی ہیں۔ اگر ان میں چند خصوصیات کا اضافہ کر دیا جائے تو سونے پر سہاگہ ہوگا۔ یو این آئی کی اردو خبروں میں ''یونی وارتا'' کی طرح اگر ہیڈنگ لگا دی جائے تو ایڈیٹر کو انتخاب میں آسانی ہوگی اور خبر کو بھی اخبار میں موزوں جگہ مل سکے گی اردو اخبارات کے قارئین کا زیادہ تر تعلق اقلیتی طبقے سے ہے وہ مشرق وسطیٰ اسلامی دنیا کی خبریں پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کو اگر یو این آئی ترجیحی بنیاد پر کور کر دے تو یہ اردو اخبارات کے لیے زیادہ سود مند ہوگا۔ دوسرے یہ کہ خبروں کی پروف ریڈنگ کا بہتر نظم کیا جائے۔

■ **شکیب خسرو، منیجنگ ایڈیٹر، روزنامہ اورنگ ٹائمز، اورنگ آباد ٹائمز کالونی، کٹ کٹ گیٹ، اورنگ آباد-431001**

مقامی (مہاراشٹر اسٹیٹ کی) خبروں کا کوریج یو این آئی اردو نیوز سروس کی جانب سے تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ بخلاف اس کے یو پی بہار وغیرہ کی خبریں منسلک کی جاتی ہیں۔ آج جبکہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور دورہ ہے قومی اور بین الاقوامی خبریں لوگ ٹی وی پر دیکھ اور سن لیتے ہیں۔ ہمارے اخبار کے قارئین کو مقامی اور ریاستی خبروں کے بارے میں تجسس اور اشتیاق رہتا ہے۔ چونکہ یہ اخبار شہر اورنگ آباد سے شائع ہوتا ہے جو کہ مہاراشٹر کا اہم شہر ہونے کے علاوہ تعلیمی، سماجی اور سیاحتی مقام کی حیثیت سے بھی بین الاقوامی شہرت و اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن پھر بھی مقامی، صوبائی، خبریں، خواہ سیاسی ہوں، سماجی ہوں، ثقافتی ہوں، تعلیمی ہوں، کھیل کی ہوں اور کسی بھی قسم کی۔ یو این آئی اردو سروس میں انھیں کوئی جگہ نہیں ملتی۔ خواہ وہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں مثال کے طور پر دھولیہ کے اتنے بڑے فرقہ وارانہ فساد، یا مہاراشٹر میں قیادت کی تبدیلی، ولاس راؤ دیشمکھ کی جگہ اشوک چوہان کا وزیر اعلیٰ بننا وغیرہ وغیرہ۔

اس لیے درخواست ہے کہ مہاراشٹر کی صوبائی و مقامی خبروں کی طرف خصوصی توجہ دیں اور یو این آئی اردو سروس میں اسے مناسب جگہ دیں تو ہمارا روزنامہ انھیں شامل کر سکے گا۔ اور قارئین بھی مستفید ہو سکیں گے۔

■ **محمد یامین حیدر، روزنامہ اقدام،**

مکتوب گرامی ملا۔ اس کے سلسلے میں درج ذیل نکات حاضر ہیں۔

1. اول یہ کہ یو این آئی سروس میں متن کی بہت زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں لہٰذا اس کی درستگی کی جائے۔
2. انگریزی اور ہندی سروس میں زیادہ خبریں آتی ہیں اس کے مقابلے میں اردو سروس میں خبریں کم آتی ہیں۔ اس پر دھیان دیا جائے۔
3. تیسرے یہ کہ یو این آئی فوٹو سروس 200 کی روزانہ کی فیس دس ہزار روپے ماہانہ ہے لہٰذا اس پر سبسیڈی دینا چاہیے ورنہ یہ سروس ہمارے لیے بیکار ہے۔

□□□

واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات

مصنف: کوکب قدر سجاد علی میرزا

نواب واجد علی شاہ کی شخصیت کا اصل معیار طے کرنے کے لیے سنی سنائی باتوں کے بجائے تاریخی شواہد کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں واجد علی شاہ کی ذاتی، سیاسی، تعلیمی وثقافتی زندگی کو تاریخ اور حقائق کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے جس میں ان کی ولادت، خاندان، تعلیم، ازدواجی زندگی، اولاد، ولی عہدی، شاہی معزولی، نظر بندی، جلاوطنی سے وفات تک کی روزمرّہ کی سرگرمیوں اور ان کی شعری و نثری تمام تصانیف کا تحقیقی مطالعہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے مصنف کوکب قدر سجاد علی میرزا کا تعلق نواب واجد علی شاہ کے خانوادے سے ہے۔

صفحات: 688، قیمت -/97 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبرنامہ

اردو سے تعصب رکھنے والے ملک کی سیکولر تہذیب کے دشمن — کپل سبل

● نئی دہلی۔ ہمارے ملک میں 80 کروڑ افراد اردو بولتے ہیں جو لوگ اردو کے تئیں تعصب رکھتے ہیں وہ اس ملک کی سیکولر تہذیب کے دشمن ہیں۔ حکومت اردو کے فروغ کے تئیں سنجیدہ ہے اور اس کی ترویج وترقی کے لیے جو بھی ممکن ہوگا ہم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ یقین دہانی آج مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کپل سبل نے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے 131 ویں یوم پیدائش کے موقع پر کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیراہتمام آندھرا پردیش بھون میں منعقد 31 ویں کل ہند اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کرائی۔ اس موقع پر مرکزی وزیرصحت غلام نبی آزاد نے تعلیمی کمیٹی کے سوونیئر کا اجرا بھی کیا۔ واضح ہو کہ مولانا آزاد کے یوم پیدائش کو "قومی یوم تعلیم" کے طور پر منایا جاتا ہے۔ کپل سبل نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ اگر ہم نے مجاہد آزادی اور عظیم رہنما مولانا آزاد کی تعلیمات پر پہلے ہی عمل کرلیا ہوتا تو جو مشکلیں آج درپیش ہیں، شاید نہ ہوتیں۔ انھوں نے کہا کہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرتعلیم کے طور پر مولانا نے بچوں کو مفت تعلیم مہیا کرانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ اب 2009 میں پورا ہوا ہے۔ اگر یہ کام پہلے ہی ہو جاتا تو آج ہم ترقی میں بہت آگے ہوتے۔ کپل سبل نے کہا کہ مولانا آزاد سچے وطن پرست تھے، انھوں نے ملک میں سیکولرازم کو مضبوط کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ ایک موقع پر انھوں نے ملک کی آزادی پر ہندو مسلم اتحاد کو ترجیح دی تھی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد بچوں کو پرائمری تعلیم ان کی مادری زبان میں دینے کے حق میں تھے لیکن آگے کی تعلیم میں وہ انگریزی کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی یہ سوچ ہی ہم سب کی سوچ ہونی چاہیے۔ کپل سبل نے کہا کہ جہاں تک اردو کے فروغ اور ترقی کی بات ہے تو وہ جو کچھ بھی کرسکتے ہیں کرنے کے لیے تیار ہیں۔

مرکزی وزیرصحت غلام نبی آزاد نے کہا کہ ملک میں اردو اور مولانا آزاد کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اپنی اردو صحافت کے ذریعے انگریز حکومت کی نیندیں اڑا دی تھیں جس کی پاداش میں انھیں کئی بار جیل جانا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہترین سیاستداں، ماہر اسلامیات، مفکر، صحافی، مقرر اور مفسر تھے۔ اس کے علاوہ حب الوطنی اور ملک کی خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایک ساتھ اتنی اہم صافت لاکھوں میں کسی ایک انسان میں ہوتی ہیں۔ غلام نبی آزاد نے کہا کہ ملک کی آزادی میں مولانا آزاد کی قربانیاں کسی بھی لیڈر سے کم نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں اب ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے۔ جب تک لوگوں کی سوچ نہیں بدلے گی تب تک سیاسی اور اقتصادی انقلاب بے معنی ہیں۔ جو لوگ آج نفرت کی زبان بولتے ہیں اگر وہ پڑھے لکھے ہوتے اور انھوں نے ملک کی آزادی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تو کم سے کم وہ اردو اور مسلمانوں کی مخالفت نہ کرتے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں شکریہ ادا کرنا چاہیے فلمی دنیا اور شاعروں کا جنھوں نے اردو کو ملک اور ملک سے باہر پوری دنیا میں پھیلانے میں اہم رول ادا کیا ورنہ سیاستداں تو اردو کو صرف الیکشن تک ہی یاد رکھتے ہیں۔

مرکزی وزیرمملکت برائے اقلیتی امور سلمان خورشید نے کہا کہ حکومت اردو کو ترویج وترقی اور قومی یکجہتی کی بقا کے تئیں اپنے عہد پر قائم ہے۔ لیکن اردو کی بقا کے لیے صرف حکومت پر ہی تکیہ کرلینا مناسب نہیں ہے، حکومت ایک حد تک یہ کوشش کرسکتی ہے۔ ہمیں اور تنظیمیں چلانے والوں کو بھی اپنی ذمے داری ادا کرنی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا اپنا ایک کلچر اور اہمیت ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا مناسب نہیں ہے کہ اردو پڑھ کے کیا حاصل ہوگا۔ جب لوگ زیادہ سے زیادہ اردو پڑھیں گے تو وہ اپنے آپ ہی روزگار سے جڑ جائے گی۔ سلمان خورشید نے منتظمین کے کہنے پر آڈی ٹیوریم میں موجود تمام مندوبین کو اردو کی ترقی، تعلیم، اتحاد، قومی یکجہتی، سیکولرازم، آپسی رواداری کے تعلق سے حلف دلایا۔ خاص بات یہ ہے کہ اردو کانفرنس کے دوران یہ حلف انگریزی میں دلایا گیا۔

صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے صدر محمد جلیل پاشا نے کمیٹی کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک میں اردو کو اس کا مقام نہیں مل سکا ہے۔ اردو اسکولوں کے طلبہ کے لیے کتابیں اور اساتذہ تک نہیں ہیں۔ انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اردو کے تعلق سے قومی پالیسی مرتب کی جائے۔ سماج وادی پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر شفیق الرحمن برق نے کہا کہ اردو کی ترویج وترقی کے لیے ہم سب کو مل کر کوشش کرنی ہوگی۔

سید شریف الحسن نقوی نے افتتاحی اجلاس کے دوران خیرمقدمی کلمات پیش کیے جبکہ نظامت مختار صدیقی نے کی۔ میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے جمشید عادل وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

تعلیم کی رسائی غریبوں تک ہو

● گینگ ٹاک۔ 29 اکتوبر، اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ طلبہ ملک کے مستقبل کے شہری ہیں، نائب صدر حامد انصاری نے آج کہا کہ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہے کہ کیا معیاری تعلیم کے شعبے میں سب کو یکساں رسائی حاصل ہے۔ یہاں ہائی کورٹ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے جس کا موضوع ''حق تعلیم، سکم کے خاص حوالے سے اور قانونی بیداری کی مہم پر اس کا اثر'' تھا، انھوں نے کہا کہ یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا نظام تعلیم تک غریبوں اور سماج کے کمزور طبقات کے لوگوں کو رسائی حاصل ہے۔ نائب صدر جمہوریہ نے اس بات پر زور دیا کہ سرکار کو یہ طے کرنا ہوگا کہ طلبہ کو اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ کاروباری اور تکنیکی تعلیم بھی حاصل ہو۔ انھوں نے کہا کہ ملک آزادی کے بعد 6 دہائیوں میں بھی 6 سے 14 سال کے سبھی بچوں کو اپنے ہی علاقے میں لازمی پرائمری تعلیم نہیں فراہم کراسکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پارلیمنٹ میں حال ہی میں منظور یہ قانون شہریوں کو تعلیم کا حق دلاتا ہے اور اس کے ذریعے ملک کی ترقی کے عمل کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ مسٹر انصاری نے کہا کہ حکومت سکم نے درست طور پر تعلیم کی اہمیت کو سمجھا ہے۔

ادب کا مطالعہ ضروری

● علی گڑھ۔ 20 اکتوبر، قانون سے متعلق پیشے میں اس کے اولین اور بنیادی اصولوں کو جاننا ضروری ہے۔ قانون کا پیشہ دنیا کے سب سے بہتر پیشوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ قانون میں کامیاب ہونے کے لیے سخت محنت اور لگن کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار آج سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور اے ایم یو کے چانسلر جسٹس اے ایم احمدی نے قانون فیکلٹی میں موٹ کورٹ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کیا۔ جسٹس احمدی نے طلبہ سے کہا کہ وہ ادب کا مطالعہ کریں کیونکہ اس کے بغیر وہ اچھے وکیل اور جج نہیں بن سکتے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز نے کہا کہ قانون کا پیشہ چیلنج سے بھرپور پیشہ ہے، جس میں سخت محنت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے ایم یو کی قانون فیکلٹی کو عالمی معیار کا بنانے کی کوشش کی جائے گی اور اس سلسلے میں انھوں نے امریکہ کی کئی لا یونیورسٹیوں خصوصی طور پر واشنگٹن لا اسکول یونیورسٹی سے رابطہ قائم کررکھا ہے اور جلد ہی دونوں یونیورسٹیوں کے درمیان آپسی تعاون کا پروگرام شروع ہوجائے گا۔

قانون فیکلٹی کے ڈین پروفیسر آئی اے خاں نے کہا کہ موٹ کورٹ کی عمارت کی تعمیر کے بعد طلبہ کے معیار میں زبردست اضافہ ہوگا اور ان میں بحث ومباحثہ کی صلاحیت بڑھے گی۔ لا سوسائٹی کے انچارج اور شعبۂ قانون میں سینئر ریڈر ڈاکٹر شکیل صمدانی نے کہا کہ جسٹس احمدی نے موٹ کورٹ کی عمارت کی بنیاد رکھ کر اور قانون فیکلٹی میں تشریف لاکر قانون فیکلٹی کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے جسٹس احمدی کے فیصلوں کا حوالہ بھی دیا۔ انھوں نے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز کی جانب سے مہیا کرائی گئی رقم کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔

آخر میں پروفیسر ایم شبیر نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اب اردو میں بھی ہوں گے ریلوے بھرتی امتحان
مدرسے کے طلبہ کو بھی ملیں گی رعایتیں

● اننت ناگ۔ 28 اکتوبر، ریل بھرتی امتحان اب اردو میں بھی ہوگا، یہ اعلان ریلوے کی وزیر ممتا بنرجی نے آج یہاں کیا۔ وادیٔ کشمیر میں اننت ناگ، قاضی گند ریل رابطے کے افتتاح کے موقع پر منعقد ایک تقریب میں ممتا بنرجی نے کہا کہ ریلوے بھرتی امتحان اب اردو میں بھی ہوگا۔ اب تک یہ انگریزی اور ہندی میں ہی ہوتا رہا تھا۔ میں نے دیگر مقامی زبانوں کے ساتھ اردو کو بھی اس میں شامل کردیا ہے۔ مرکزی وزیر نے کہا کہ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو دی جانے والی ریلوے رعایتیں اب مدرسوں کے طلبہ کو بھی ملیں گی۔ انھوں نے اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والی خواتین اور مالی طور سے کمزور طبقے کے افراد کے لیے بھی بہبودی پروگرام کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ اقلیتی طبقے کی خواتین اور مالی طور سے کمزور لوگوں کے لیے ریلوے بھرتی فارم کے ساتھ پوسٹل آرڈر بھرنا ضروری نہیں ہوگا، ریلوے بھرتی امتحان اب پورے ملک میں ایک ہی دن کرائے جائیں گے تاکہ سبھی ریاستوں کے لوگوں کو فائدہ حاصل ہوسکے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو اساتذہ کی تقرری کا مسئلہ

● نئی دہلی۔ 27 اکتوبر، دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں میں خالی اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے اساتذہ کی تقرری کا مسئلہ ممکن ہے اب حل ہوجائے کیونکہ وزیر تعلیم دہلی سرکار اروندر سنگھ لولی نے آج صاف طور پر کہا ہے کہ وہ دسمبر تک اردو میڈیم اساتذہ کی تقرری کردیں گے۔ آج انجمن ترقی اردو ہند کے ایک وفد نے جس میں ممبر اسمبلی شعیب اقبال، ڈاکٹر خلیق انجم، شاہد ماہلی، تنویر صدیقی، جاوید رحمانی، محمد ساجد اور پرویز صدیقی وغیرہ شامل تھے، دہلی سکریٹریٹ میں وزیر تعلیم اروندر سنگھ لولی سے ملاقات کرتے ہوئے اردو اساتذہ کی تقرری کا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا اور انھیں تحریری طور پر یاد دلایا کہ آپ نے یہ بات

کہی تھی کہ اگر اردو میڈیم کے اساتذہ ملتے ہیں تو ہم ان کی تقرری کرنے کو تیار ہیں۔ وفد نے وزیر تعلیم کو اردو میڈیم بی ایڈ اساتذہ کی ایک مکمل فہرست پیش کی اور امیدواروں کے ذریعے اردو گھر میں جمع کرائے گئے تقریباً 150 بایو ڈاٹاز بھی دیکھے اور کہا کہ ان کی ایک بار اور جانچ کرکے انھیں سونپ دیا جائے تاکہ وہ خالی اسامیوں کا اعلان کرسکیں۔ یہ بھی مطالبہ کیا کہ تقرری اردو اکادمی کے ذریعے نہ کرائی جائے بلکہ یہ تقرری وزارت کی طرف سے ہونی چاہیے۔ اس پر بھی وزیر تعلیم نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ وزیر تعلیم نے کہا کہ اردو میڈیم اساتذہ کی تقرری کے لیے ایک ہفتے کے اندر اندر ایک پانچ رکنی کمیٹی تشکیل دی جائے گی جس میں اردو کے ماہرین کو شامل کیا جائے گا تاکہ وہ اس کام میں ان کی مدد کرسکیں۔ مسٹر لولی نے کہا کہ ہم نے سخت ہدایات جاری کی ہیں کہ دہلی کا کوئی بھی اردو میڈیم اسکول بند نہیں ہوگا خواہ اس میں دو ہی طلبہ کیوں نہ پڑھ رہے ہوں۔ مسٹر لولی نے کہا کہ اقلیتی علاقوں میں اسکول کھولنے کا سرکار کا منصوبہ ہے اگر کوئی اسکول کھولنے کی جگہ دلاتا ہے یا کرائے پر دیتا ہے تو وہاں سرکاری اسکول کھول دیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ سرکار ان اسکولوں میں بھی سیکنڈ شفٹ چلانے کو تیار ہے جہاں ایک شفٹ میں اسکول چلائے جارہے ہیں۔ (ہمارا سماج، دہلی)

تعلیم کا مقصد صرف روزگار کا حصول نہ ہو

● علی گڑھ۔ 20 اکتوبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایس ٹی ایس ہائی اسکول (منٹو سرکل) کے قیام کے 134 سال مکمل ہونے پر اسکول میں منعقدہ دو روزہ صدی تقریبات آج اختتام پذیر ہوئیں۔ پروگرام میں آج اسکول کے سابق طلبہ نے مستقبل کے چیلنجیز کے پیش نظر اپنی مادر علمی کی ترقی پر غور وفکر کیا اور اسکول کے طلبہ اور ان کے سرپرستوں سے رابطہ قائم کیا اور مختلف مقابلوں کے فاتح طلبہ وطالبات کو انعامات سے سرفراز کیا۔ اختتامی تقریب کے مہمان خصوصی پاکستان کے سابق فوجی افسر اور ایس ٹی ایس ہائی اسکول کے سابق طالب علم بریگیڈیئر اقبال ایم شفیع نے کہا کہ تعلیم کا مقصد صرف روزگار حاصل کرنے تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ طلبہ کی کردار سازی پر بھی خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز نے کہا کہ ان کی یہ کوشش ہے کہ اے ایم یو کے تمام اسکول قومی، عالمی اسکولوں کی صف میں شامل ہوں اور یہاں کے اسکولوں کے طلبہ آئی آئی ٹی کے علاوہ کل ہند سطح پر منعقد ہونے والے مختلف مقابلوں میں کامیابی حاصل کریں۔ اے ایم یو رجسٹرار اور اسکولوں کے نیجر پروفیسر وی کے عبدالجلیل نے سابق طلبہ سے اپیل کی کہ وہ اسکول کی عمارت کی تزئین کاری کے لیے اپنا تعاون پیش کریں۔ اسکول کے پرنسپل مسٹر فیصل نفیس نے دو روزہ پروگرام کے دوران تیار کی گئی تجاویز پڑھ کر سنائیں جن کی سبھی نے تائید کی۔ سیمینار میں آرتھوپیڈک سرجن پروفیسر خالد شروانی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سابق طلبہ اسکول کو بہتر بنانے کے لیے آگے آئیں۔ انھوں نے کہا کہ ایس ٹی ایس ہائی اسکول کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے اس سے تعلق اور رقم دونوں کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنی جانب سے دس ہزار روپے کی رقم اسکول کے فنڈ میں دی۔ پروفیسر عشرت حسین فاروقی نے کہا کہ ادارے اور اساتذہ سے محبت کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر خواجہ شمیم احمد نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ سارے ملک میں پھیل جائیں اور علم کا چراغ روشن کریں۔ پروفیسر اے آر قدوائی نے کہا کہ انسانی وسائل ترقی کا سب سے اہم حصہ ہیں جس کے لیے اساتذہ اور سرپرستوں کی ذمے داری ہے کہ طلبہ کو تیار کیا جائے۔

پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے جے این میڈیکل کالج کے پرنسپل پروفیسر اشرف ملک نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر کنٹرولر برائے امتحانات پروفیسر پرویز مستجاب، ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر ایم زبیر خاں اور فائنٹس آفیسر محترمہ یاسمین جلال بیگ بھی موجود تھیں۔ (ہمارا سماج، دہلی)

گھروں میں بھی اردو کو فروغ دیں

● نئی دہلی۔ اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے 9 روزہ رخ ساز/تربیتی (اورینٹیشن) پروگرام کا اختتامی جلسہ ٹیچرس ٹریننگ کالج میں منعقد کیا گیا۔ اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر غضنفر علی نے اس موقع پر کہا کہ اکادمی اس بات کی پوری کوشش کررہی ہے کہ اردو کے تئیں اردو والوں میں جو احساس کمتری گھر کرگیا ہے، اسے دور کیا جاسکے اور اردو اساتذہ، طلبہ اور ان کے والدین کو یہ احساس دلایا جاسکے کہ اردو وہ زبان ہے جو کردار سازی اور شخصیت کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اعلیٰ عہدوں مثلاً آئی اے ایس، آئی پی ایس اور الائڈ سروسیز پر بھی لوگوں کو پہنچانے کا کام انجام دے رہی ہے۔ جلسے کے مہمان خصوصی پروفیسر حسن محمود، ڈائرکٹر اکیڈمک اسٹاف کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہی نہیں ہماری تہذیب وثقافت اور مذہبی روایات کی بھی زبان ہے۔ اس لیے اس کا پڑھنا ضروری ہے۔

جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شفیق اللہ نے کہا کہ بیرونی ممالک میں ہندوستانی باشندے اپنی اپنی مادری زبانوں کا تحفظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے بچے اپنی مادری زبان میں بات کرتے ہیں، مگر اس کے برعکس اردو والے اردو کے بجائے انگریزی کو فوقیت دیتے ہیں۔ اگر اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اردو والوں کو بھی وہی رویہ اپنانا ہوگا جو دوسری زبانوں کے افراد اپنی چہار دیواریوں میں اپنی اپنی زبان کی پرورش کے لیے اپنا رہے ہیں۔ انھوں نے یہ

بھی کہا کہ اردو کے تئیں اردو اساتذہ کی توجہ میں کمی آتی جارہی ہے۔ اس موقع پر چھتیس گڑھ کے اساتذہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اس پروگرام سے اردو درس و تدریس سے متعلق بہت ساری نئی باتیں سیکھیں اور پروفیسر غضنفر کی قیادت میں جامعہ کی اردو اکادمی بہت ہی کارآمد پروگراموں کے انعقاد کے علاوہ عملی اقدامات کررہی ہے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر حلیمہ سعدیہ نے کی۔ پروگرام کی کوآرڈی نیٹر زبیدہ حبیب تھیں۔ آخر میں ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے اظہار تشکر کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

تعلیم پر مزید خرچ کی ضرورت

● نئی دہلی۔ 23 اکتوبر، برطانیہ سے ہندوستان کے دورے پر آئے ہوئے اساتذہ کے ایک گروپ کا کہنا ہے کہ دونوں ملکوں میں بچوں کے طریقۂ تعلیم میں بڑی حد تک یکسانیت ہے لیکن یہاں حکومت کو تعلیم پر مزید خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ برٹش ہائی کونسل نے ٹیچرس انٹرنیشنل پروفیشنل ڈیولپمنٹ TIPD پروگرام کے تحت اس دورے کا اہتمام کیا ہے جس میں برطانیہ کے سات اسکولوں کے 15 اساتذہ شامل ہیں۔ گروپ کی لیڈر ایلیسن ڈاویس نے یو این آئی سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ دونوں ملکوں میں بچوں کے طریقۂ تعلیم میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ بچے نئی نئی چیزیں سیکھنا چاہتے ہیں اور اساتذہ کی دلچسپی سے ان کے لیے سیکھنا آسان ہوجاتا ہے۔ اس گروپ نے دہلی کے کئی اسکولوں کا دورہ کیا۔ جن میں اوکھلا میں واقع آئیڈیل پبلک اسکول، نوئیڈا میں واقع ایم اے ایف اکیڈمی، دنے نگر کا بنگالی اسکول، گرونانک پبلک اسکول، سینٹ میری اسکول، کیندریہ ودیالیہ، راجکیہ پربھا اسکول اور سرودیہ ودیالیہ شامل ہیں۔ محترمہ ڈاویس نے کہا کہ یہاں کے مقابلے برطانیہ کے اسکولوں کے پاس زیادہ وسائل ہیں۔ یہاں بعض اسکولوں کے پاس وسائل کی بڑی کمی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ حکومت کی ذمے داری ہے کہ مستقبل کے معماروں کے لیے قومی بجٹ کا زیادہ حصہ مختص کرے۔ برٹش ہائی کونسل کی رکن پرتی کوہلی نے یو این آئی کو بتایا کہ اس دورے کا مقصد برطانوی اساتذہ کو ہندوستانی رنگارنگ ثقافت سے آگاہ کرانا ہے۔ اسی لیے انھیں مختلف فرقوں کے ذریعے چلائے جانے والے اسکولوں کے دورے کرائے جارہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ اساتذہ اپنے دورے کے تجربات سے اپنے طالب علموں کو آگاہ کریں گے۔ اس گروپ میں شامل لیسٹر کے میز ہائی اسکول کی ٹیچر کارولین چین فولڈ نے کہا کہ یہ تجربہ ان کے لیے ایک خواب جیسا ہے۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہاں بچے اتنی روانی کے ساتھ انگریزی میں ہمارے سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم نے دیکھا کہ یہاں کے بچے بڑے شریف اور نیک ہیں اس کے برخلاف ہمارے یہاں بعض اوقات طلبہ انتہائی پرتشدد ہوجاتے ہیں۔ کرسٹوفر ٹانگ نامی سائنس ٹیچر نے کہا کہ یہاں کے اساتذہ اور طالب علموں کو اپنے موضوعات کا اچھی طرح علم ہے اور وہ بہت خوش اخلاق بھی ہیں۔ ہالی ویل پرائمری اسکول کی ٹیچر گیز لاورک نے کہا کہ یہاں کا تجربہ ہمارے لیے ناقابل یقین ہے۔ ایلیسن ڈیواس نے کہا کہ انھیں سہولیات کی کمی کے باوجود چلنے والے آئیڈیل پبلک اسکول کے بچوں کی صلاحیتوں اور ڈسپلن نے حد درجہ متاثر کیا۔ انھوں نے اسکول انتظامیہ سے مسلم کلچر کے بارے میں جاننے کی خواہش کی تھی۔ اسکول کی پرنسپل تسنیم فاطمہ نے بتایا کہ مہمان وفد کو عید کے حوالے سے ایک ڈراما دکھایا گیا اور بچوں نے اقبال کی مشہور نظم لب پہ آتی ہے...... سنائی جس کا انگریزی ترجمہ بھی انھیں بتایا گیا۔ محترمہ تسنیم فاطمہ نے بتایا کہ جب بچوں نے السلام علیکم کہہ کر مہمانوں کا استقبال کیا تو برطانوی وفد نے اس کا مطلب معلوم کیا اور وعلیکم السلام کہہ کر جواب دیا۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

سجاد ظہیر میموریل لیکچر کا انعقاد

● نئی دہلی۔ 2 نومبر، حافظ زندگی کا استقبال کرتا ہے۔ انسانوں سے بلاتفریق محبت کرتا ہے۔ اس کے یہاں انسان کی وہی جستجو ہے جو روی کو تھی۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز سفارت کار اور فارسی زبان و ادب کے رمز آشنا سید عزیز الدین عثمانی نے کیا۔ وہ یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام سجاد ظہیر یادگاری خطبہ دے رہے تھے۔ جس کا انعقاد جامعہ کے یوم تاسیس کی تقریبات کے تحت کیا گیا۔ سید عزیز الدین نے ''حافظ شیرازی احوال وکلام'' کے موضوع پر اپنے خطاب میں کہا کہ حافظ شیرازی نے اپنے کلام میں زمانے کے حالات پر نگاہ ڈالتے ہوئے ایک نئی دنیا کی تعمیر کی آرزو کی تھی۔ مغربی ممالک، ایشیا اور برصغیر کے شعرا، ادبا اور اہل دانش پر حافظ کے اثرات کو مثالوں کے ساتھ بیان کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ نطشے، گوئٹے، وکٹوریائی عہد کے انگریز شعرا اور فلسفیوں کے علاوہ راجہ رام موہن رائے اور رابندرناتھ ٹیگور حافظ سے بے حد متاثر تھے۔

تقریب کی صدارت پروفیسر مجیب رضوی نے کی۔ اپنی تقریر کے دوران انھوں نے سجاد ظہیر میموریل لیکچر میں حافظ کو موضوع بنائے جانے کو سجاد ظہیر کو سچا خراج عقیدت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند تحریک مختلف زبانوں اور مختلف مکتبہ فکر کے لوگوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کراتی تھی۔ ہندوستان میں اس تحریک کے بانی سجاد ظہیر تھے۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شمس الحق عثمانی نے خیر مقدمی کلمات کے دوران سجاد ظہیر کو وسیع ذہن کا مالک اور تجدید و تعمیر کا متمنی قرار دیا۔

پروفیسر وہاج الدین علوی نے دوران نظامت کہا کہ سجاد ظہیر نے اپنی

66 سالہ زندگی میں ہر گوشے میں اپنے فکر وعمل کے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان نقوش کی روشنی میں وہ مفکر، ادیب اور شاعر کے علاوہ انسان گر اور انسان نگر نظر آتے ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے اظہار تشکر کے دوران سید عزیز الدین عثمانی کی خطبے کو پرمغز اور بے انتہا معلوماتی قرار دیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی، غلام حیدر، رفیق شاستری، ڈاکٹر شہپر رسول، فرحت احساس، ڈاکٹر خالد جاوید ڈاکٹر شہناز انجم، ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر سرورالہدیٰ، ڈاکٹر عمران عندلیب کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مخطوطات کے تحفظ پر ورکشاپ

● رامپور۔ 8 نومبر، رامپور رضا لائبریری کے رنگ محل میں پانچ روزہ ورکشاپ کے افتتاحی پروگرام کا آغاز ڈاکٹر عرفان کے ذریعے تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد میں مہمان خصوصی پروفیسر ہری شنکر مشرا نے چراغ روشن کرکے افتتاح کیا۔ رضا لائبریری کے افسر بکار خاص پروفیسر شاہ عبدالسلام نے اس موقع پر کہا کہ مخطوطات کی ہماری زندگی میں جو اہمیت ہے اسے سمجھنا ہماری ذمے داری ہے۔ یورپی ممالک نے قدیم مخطوطات کے تحفظ کے بہت سے طریقے ڈھونڈ لیے ہیں۔ یہ پانچ روزہ ورکشاپ کا انعقاد اسی لیے ہو رہا ہے کہ دور دور سے آنے والے تفصیل سے سمجھائیں گے کہ کس طرح ان نادر مخطوطات کو تحفظ فراہم کریں۔ لکھنؤ سے آئی ٹیک کی ڈائرکٹر ممتا مشرا نے کہا کہ دس فیصد کتابیں لائبریری، میوزیم میں ہیں جبکہ زیادہ تر کتابیں لوگوں کے گھروں میں ہی رکھی ہیں ان کے رکھ رکھاؤ کے طریقوں کی جانکاری ضرور ہونا چاہیے۔ شریف الرحمٰن خاں نے کہا کہ آج کی نسل پڑھنے سے کترا رہی ہے۔ ٹی وی، انٹرنیٹ سے تمام جانکاری مل جاتی ہے ہمیں اپنے اسلاف کی امانت کو حفاظت سے رکھنے کا ذوق ہونا چاہیے۔ پروفیسر ہری شنکر مشرا نے کہا کہ یہی مخطوطات ہماری وراثت ہیں ہمارے اسلاف نے سینکڑوں سال پہلے اپنے ہاتھوں سے انھیں لکھا تھا۔ نئی نسل کو بیدار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حفاظت کے جدید طریقے اسے سکھائے جائیں۔ لائبریرین ابوسعد اصلاحی نے بھی تفصیل بتائی۔ رستم علی خاں نے شکریہ ادا کیا اور سکینہ نے نظامت کی ذمے داری نبھائی۔

(صحافت، دہلی)

اقلیتی طلبہ کو ایوارڈ سے نوازا گیا

● لکھنؤ۔ 8 نومبر، ہیومن ویلفیئر فاؤنڈیشن نئی دہلی اور پی ایم فاؤنڈیشن کیرالہ کے اشتراک سے اترپردیش کے مسلم اقلیتی طلبہ کو آج سکندر آباد، چوراہا پر منعقد تقریب میں ایوارڈز سے سرفراز کیا گیا اور اترپردیش کے مختلف اضلاع سے آئے تقریباً 750 طلبہ کو نقد رقم اور توصیف ناموں سے نوازا گیا۔ فاؤنڈیشن کی جانب سے منعقد انعامی تقریب میں طلبہ کے علاوہ بڑی تعداد میں شہر کے معزز حضرات نے حصہ لیا۔ واضح رہے کہ ہیومن ویلفیئر فاؤنڈیشن نے نئی دہلی میں مسلم اقلیتی طلبہ کے لیے ویژن 10، 201 پروگرام کی شروعات کی ہے۔ جس کے تحت تعلیم، صحت اور روزگار سمیت دوسرے پروجیکٹوں پر کام چل رہا ہے۔ ہیومن ویلفیئر فاؤنڈیشن نے مسلم سماج میں تعلیم کے تئیں بیداری لانے کے لیے اس انعام کی یوپی سے شروعات کی ہے۔ واضح رہے کہ اسے ملک کی دوسری ریاستوں میں بھی منعقد کرنے کا پروگرام ہے۔ اس کے تحت مارچ 2009 کی ہائی اسکول بورڈ امتحان اور آئی سی ایس ای، سی بی ایس ای، یوپی بورڈ مدرسہ بورڈ میں جن طلبہ نے 60 فیصد یا اس سے زائد نمبر حاصل کیے ہیں انھیں ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ فاؤنڈیشن نے 1000 اسکولوں کی تعمیر، اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک لاکھ طلبہ کو وظیفہ وغیرہ کا بھی انتظام کیا ہے۔ صحت اور روزگار کے معاملے میں بھی مختلف کام ہو رہے ہیں۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری کے اے صدیق حسن نے کہا کہ ہمارا ماننا ہے کہ تعلیم کے بغیر کسی بھی سماج کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اس انعام کا مقصد مسلم طلبہ کی حوصلہ افزائی ہے۔ اس پروگرام کو کیرالہ مسلم لیگ کے سینئر لیڈر ایم پی ای احمد فاؤنڈیشن کے نائب چیئرمین محمد جعفر صاحب، مولانا خالد رشید فرنگی محلی وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ ان کے علاوہ ایس ایم کاظمی، وریندر کمان سکسینہ وغیرہ بھی موجود تھے۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

فروغ تعلیم پر زور

● سہارنپور۔ 25 اکتوبر، آج یہاں جن منچ گاندھی پارک میں مسلم راجپوت برادری کے اجلاس میں جہالت اور بے جا رسومات کو معاشرے کا ناسور قرار دیتے ہوئے تعلیم کے فروغ اور اصلاح معاشرہ پر زور دیا گیا۔ فیض عام انٹر کالج میرٹھ کے پرنسپل غلام محمد نے اجلاس کی شمع روشن کی جب کہ صدارت اتراکھنڈ کے پردھانوں کی ایسوسی ایشن کے صدر راؤ آفاق نے کی۔ راؤ عبدالرزاق کی زیر سرپرستی اس اجلاس میں ضلع سہارنپور کی مسلم راجپوت برادری کے افراد کے علاوہ میرٹھ کمشنری اور اتراکھنڈ کی کئی سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔ اجلاس میں تعلیم کے میدان میں ہائی اسکول سے لے کر اعلیٰ درجات تک تعلیم حاصل کرنے والے 202 طلبہ وطالبات کے علاوہ 50 حفاظ کرام کو بھی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ علاوہ ازیں سماجی اور سیاسی میدان میں خدمات انجام دینے والی 69 شخصیات کے ساتھ 75 پردھانوں کو بھی ایوارڈ دیا گیا۔ یہ اعزازات مسرور خاں سروہہ، جنرل شاہنواز، علامہ رفیق، راؤ مختار علی خاں ایڈوکیٹ، راؤ مشتاق خاں، راؤ رافع خاں اور ڈاکٹر راؤ شفیق مرحومین کے نام سے منسوب تھے۔ اظہار کرنے اور شرکت کرنے والوں میں غلام محمد، راؤ

آفاق، راؤ عبدالرزاق، حاجی یعقوب خاں، راؤ عبدالستار، راؤ قیصر سلیم، حمید خاں سردہہ، ریاست علی چودھری، راؤ آفتاب وغیرہ نمایاں تھے۔ اجلاس کی نظامت راؤ عبدالستار نے کی جب کہ قاری راؤ عبدالرحمٰن کی تلاوت کلام پاک اور قاری راؤ مجاہد کی نعت سے اجلاس کا آغاز ہوا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

عوامی مشاعرے شعرا کو معتبر نہیں بناتے

● نئی دہلی۔ 2 نومبر، عوامی مشاعرے شعرا کو شہرت تو ضرور عطا کرتے ہیں مگر معتبر نہیں بناتے۔ اعتبار حاصل کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی نشستوں کی ضرورت ہے جہاں مشق و ریاض، اوزان و بحور، فکر تازہ اور حفظ مراتب کی تربیت ہوتی رہتی ہے۔ ممتاز ادیب و شاعر اور عالمی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ نیز اردو پریس کلب کے وائس چیئرمین پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے ان خیالات کا اظہار اردو پریس کلب کی جانب سے منعقد ایک شعری نشست کے دوران اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ جمہوریت کی ہوائے خوشگوار کے باعث عوامی مشاعرے ایک بے ہنگم درخت کی طرح ہوگئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی کاٹ چھانٹ اس طرح کی جائے کہ اردو کا یہ ادارہ رابطۂ عامہ اپنا ادبی اور تہذیبی فریضہ بحسن وخوبی ادا کر سکے۔ اسد منزل میں ملک زادہ منظور احمد کے اعزاز میں آراستہ کی گئی اس باوقار شعری محفل میں جرمنی میں مقیم شاعر عمر فاروق نے مہمان خصوصی اور معروف کالم نویس عظیم اختر نے مہمان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ کلب کے جنرل سکریٹری طارق فیضی نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر جن شعرا اور شاعرات نے اپنا کلام پیش کیا ان کے اسمائے گرامی ہیں:

ملک زادہ منظور احمد، عمر فاروق، فصیح اکمل، تابش مہدی، رؤف رضا، ملک زادہ جاوید، تسیم نیازی، راشدہ حیاباتی، مولا بخش اسیر، وسیم راشد، اطہر بنارسی، عرفان احمد، رحمان مصور، معین شاداب، سیّد تالیف حیدر۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو والے احساس کمتری سے باہر نکلیں

● نئی دہلی۔ 26 اکتوبر، اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے ایک نو روزہ رخ ساز، تربیتی پروگرام کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاحی جلسہ 26 اکتوبر جامعہ کے ٹریننگ کالج کے کیمپس میں منعقد ہوا۔ جلسے کا افتتاح فیکلٹی آف ایجوکیشن کے ڈین پروفیسر محمد میاں نے کیا۔ اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر غضنفر علی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اردو والے خود کو احساس کمتری کی دلدل سے باہر نکالیں اور اردو کو وہ مرتبہ دینا شروع کریں جو اس زبان کو ان کے اسلاف دیا کرتے تھے۔ غضنفر نے یہ بھی کہا کہ آج میڈیا نے اردو والوں کے لیے روزگار کے مواقع بھی مہیا کر دیے ہیں مگر ان مواقع سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کی اردو مؤثر، بہتر اور طاقت ور ہوگی۔ اس لیے اساتذہ کو چاہیے کہ وہ نئے طریقۂ تدریس اپنا کر اپنی اردو بہتر کریں اور پھر اپنے طلبہ کی اردو کی بہتری کی طرف دھیان دیں۔ جلسے کی صدارت سابق صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر علی رفاد فتیحی نے کی۔ پروفیسر فتیحی نے کہا کہ میں بغیر کسی تامّل اور جھجک کے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اکادمی کو تینوں اردو اکادمیوں میں فوقیت حاصل رہی ہے۔ اس لیے کہ یہ اکادمی نہ صرف یہ کہ مختلف صوبوں کے لیے پروگرام کر رہی ہے بلکہ مختلف نوعیت کے پروگراموں کا اہتمام کر رہی ہے اور اس کا سہرا پروفیسر غضنفر کے سر ہے جن میں اکادمی کے کاموں کے تئیں جنون ہے۔ یہ ان کا جنون ہی ہے جو ان سے ایسے ایسے کام سلیقے کے ساتھ کروا لیتا ہے۔ اس نو روزہ رخ ساز، تربیتی پروگرام میں ریاست چھتیس گڑھ کے تقریباً پچاس اساتذہ شرکت کر رہے ہیں۔ پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ پروگرام کی کورآرڈینیٹر زبیدہ حبیب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سرسید نے عام فہم اردو زبان دی

● نئی دہلی۔ 8 نومبر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ''سرسید میموریل لکچر'' کا انعقاد کیا گیا، جس میں پدم شری مہرالنسا پرویز، عارف محمد خان، عارفہ خانم، اے چودھری، خواجہ محمد شاہد، صفدر ایچ خان، سندیپ سنگھ، عبدالحفیظ گاندھی، سید ابرار چیکو، ایاز الدین ہاشمی سمیت علیگ برادری نے شرکت کی۔ اس موقع پر مقررین نے کہا کہ سرسید احمد خان نے اردو کو صنائع بدائع سے آزاد کرا کر ہندوستانیوں کو آسان اردو زبان تحفتاً عنایت کی۔ انھوں نے ایسے دور میں ہندوستانی مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھ کر تعلیمی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کی سعی پیہم کی جب ہند پر برٹش سامراجیت کا سورج پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ سرسید آگرہ میں انگریزوں کی محفل سے اس لیے اٹھ کر چلے آئے کہ وہاں ہندوستانیوں کی کرسی انگریزوں کے بالمقابل نیچی تھی یہ ان کے ہندنواز ہونے کے لیے کافی ہے۔ مقررین کا کہنا تھا کہ سرسید کو سمجھنے کے لیے ''غدر'' کے حالات کو جاننا بے حد ضروری ہے ورنہ سرسید کی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں ہو پائے گا۔ علامہ شبلیؒ نے علی گڑھ سے فیض حاصل کرنے کے بعد ہی ندوہ کی بنیاد ڈالی اور سرسید کے مخالفین ہی ان کے حامی بن کر افق پر آفتاب کی طرح چمکے۔ سرسید نے انگلستان جا کر عیسائیت کو سمجھا اور رنگیلا رسول کا مدلل جواب لکھا۔ انھوں نے تمام تر مخالفتوں کے باوجود کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور اپنی تحریک میں دلجمعی کے ساتھ لگے رہے۔ 1857 میں سرسید کی مخالفت میں

علمائے کرام نے انگریزی کو حرام قرار دے دیا تھا اور ان پر کفر کا الزام لگاتے ہوئے 5 عربی اور دس ہندی فتوے جاری کیے تھے اس کے باوجود وہ اپنے مشن میں لگے رہے اور آج تقریباً عرب ممالک سمیت پوری دنیا بلاتفریق مذہب و ملت انگریزی پڑھتی اور پڑھاتی ہے۔ انھوں نے 1887 میں محمڈن انگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی جس نے 1920 میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا۔

(ہمارا سماج، دہلی)

سرسید سے قبل اردو نثر میں علمی زبان کا وجود نہیں تھا

● نئی دہلی۔ 19 اکتوبر، سرسید سے قبل اردو نثر میں علمی زبان کا وجود نہیں تھا اس اعتبار سے اردو نثر سرسید کی احسان مند ہے۔ انھوں نے ''آثارالصنادید''، ''آئین اکبری''، ''اسباب بغاوت ہند'' اور دوسری کتابوں کے وسیلے سے اردو نثر کو علمی نثر سے قریب کردیا۔ ان خیالات کا اظہار صدر شعبۂ اردو پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کیا۔ وہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیراہتمام سرسید کی یاد میں منعقدہ تقریب میں اپنے تاثرات پیش کررہے تھے۔ اس موقع پر معروف ناول نگار پروفیسر غضنفر ڈائرکٹر اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے خصوصی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرسید نے اپنے عہد کے آشوب اور انتشار کو زیادہ شدت سے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس سے نجات کی صورت بھی نکالی۔ انھوں نے کہا کہ سرسید کی حکمت عملی اور تعلیمات آج بھی کروڑوں لوگوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرسید دردمند دل، اعلیٰ دماغ، مؤثر ذریعۂ اظہار اور خود اعتمادی رکھتے تھے جس کے سبب انھوں نے تعلیمی کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی جو صورت حال تھی اس سے سب واقف تھے لیکن سرسید نے مسائل کو حل کرنے کے لیے تدبیریں کیں اور راستہ تلاش کیا۔ جدید علوم کی طرف قوم کو متوجہ کیا۔ اس تقریب کی صدارت صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی سرینگر پروفیسر قدوس جاوید نے کی۔ انھوں نے کہا کہ سرسید کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں قوم جس طرح زوال پذیر ہے اس سے نجات حاصل کرنے کی سبیل نکالی جائے۔ پروفیسر ابن کنول نے یوم سرسید کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر ابوبکر عباد نے مہمانوں کا بطور خاص شکریہ ادا کیا نیز طلبہ اور طالبات سے سرسید کے تعلیمی نظریات اور علمی اقدامات سے استفادہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس خصوصی تقریب میں شعبۂ اردو کے اساتذہ کے علاوہ طلبہ اور طالبات نے شرکت کی۔ سامعین نے پروفیسر غضنفر کے خطبے کو کافی پسند کیا۔

(ہمارا سماج، دہلی)

صالحہ عابد حسین کی ادبی خدمات پر سیمینار

● پنچکولہ۔ ہریانہ اردو اکادمی کے زیراہتمام اکادمی بھون پنچکولہ میں اردو کی معروف ادیبہ اور قلمکار صالحہ عابد حسین کی ادبی خدمات پر ایک روزہ قومی سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید، ممبر پلاننگ کمیشن حکومت ہند نے کیا۔ اس موقع پر انھوں نے اکادمی بھون میں شجرکاری بھی کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں پرانی یادوں کے حوالے سے صالحہ عابد حسین کی فکری صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم آج جو کچھ بھی ہیں انھی کی شفقت محبت اور تربیت کی بدولت ہیں۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پنچکولہ کی سٹی مجسٹریٹ محترمہ ریتو چودھری نے کی ابتدا میں پدم شری کشمیری لال ذاکر، سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی نے پروگرام کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی اور صالحہ عابد حسین کی ادبی اور سماجی خدمات کا ذکر کیا۔ سیمینار میں کلیدی خطبہ معروف ادیبہ پروفیسر صغرا مہدی نے پیش کیا اور صالحہ عابد حسین کو دختر ہریانہ بتاتے ہوئے ان کے حالات زندگی اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا۔

وقفۂ طعام کے بعد سیمینار کا پہلا مقالاتی اجلاس ہوا جس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر سیدہ سیدین، جناب کشمیری لال ذاکر اور ڈاکٹر خوشحال زیدی شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نشاں زیدی نے انجام دیے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر شہپر رسول نے ''صالحہ عابد حسین کی خودنوشت سوانح نگاری۔ سلسلۂ روز وشب کی روشنی میں'' اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی نے ''بچوں کی صالحہ عابد حسین''، ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے ''صالحہ عابد حسین سے یادیں اور ملاقاتیں''۔ جناب مہیندر پرتاپ چاند نے ''بیگم صالحہ عابد حسین کے کچھ امتیازی پہلو'' اور جناب محمد مستمر نے ''صالحہ عابد حسین کی افسانہ نویسی ایک تنقیدی جائزہ'' عنوانات کے تحت مقالے پڑھے۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر صغرا مہدی اور ڈاکٹر شہپر رسول شامل تھے جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے انجام دیے۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر نشاں زیدی نے ''صالحہ عابد حسین کے ناولوں میں نسائی حسیت''

عنوان کے تحت اور ڈاکٹر محمد ایوب خاں نے ''صالحہ عابد حسین اور ان کی افسانہ نگاری'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا جبکہ آخر میں جناب امرسا ہی نے ''صالحہ عابد حسین کی تحریروں میں ہندوستانی عورت'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ اپنے صدارتی خطبہ میں پروفیسر صغرا مہدی نے تمام مقالوں کا اختصار پیش کرتے ہوئے سیمینار کو نہایت کامیاب قرار دیا۔ جناب کشمیری لال ذاکر نے فرمایا کہ مقالوں کو اکادمی کی جانب سے کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا اور

اکادمی صالحہ عابد حسین کی بہترین کہانیوں کو دیوناگری میں شائع کرے گی سیمینار کے آخر میں اکادمی کے مدیر جناب شمس تبریزی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

وامق جونپوری پر سیمینار

● الہ آباد۔ 25 اکتوبر، اردو کا مسئلہ ایسا نہیں ہے جو حل نہ ہو سکے بس اس کے حل کے لیے ہمیں متحدہ طور پر آگے آنے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار یوپی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین سید محمد علی کاظمی ایڈوکیٹ نے کیا۔ وہ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے زیر اہتمام وامق جونپوری صدی تقریبات کے موقع پر منعقدہ سہ روزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی اپنے خیالات پیش کر رہے تھے۔ اس موقع پر مسٹر کاظمی نے وامق جونپوری کو بھی خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے ادبی کارناموں کا اعتراف کیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے رام جی رائے (پٹنہ) نے کہا کہ ادب میں بازار واد نہیں چلے گا یہ بازار اور کا ہی اثر ہے کہ ہم کسی کو اول درجے کا ادیب و شاعر قرار دے رہے ہیں تو کسی کو دوئم درجے کا۔ انھوں نے کہا کہ ہر قاری کو حق ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ شاعر کو اپنے طور پر پڑھے اور پسند کرے۔ معروف ترقی پسند ادیب و ناقد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سیمینار میں کچھ مقالہ نگاروں نے مقصدی شاعری کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو درست نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ مقصدی شاعری کو دوئم درجے کی شاعری تصور کرنا غلط ہے۔ وامق جونپوری کو محض اس لیے دوئم درجے کا شاعر قرار دیا جائے کہ انھوں نے مقصدی شاعری کی ہے، ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی ہمارے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے مقصدی ادب تخلیق کیا ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ افتتاحی اجلاس میں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر علی جاوید، صدر شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی پروفیسر شہناز نبی، علی گڑھ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر راشد انور راشد، شعبۂ اردو بنارس یونیورسٹی کی استاد ڈاکٹر نفیس بانو اور صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی پروفیسر رضی الرحمن نے مقالے پڑھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر صالحہ زرین نے انجام دیے۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر علی احمد فاطمی نے سیمینار کو کامیاب بنانے کے لیے تمام مقررین اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس سیمینار سے نئی نسل میں وامق کے تعلق سے ایک اہم پیغام جائے گا۔ تقریب میں ڈاکٹر فخر الکریم، ڈاکٹر حسین اختر، پروفیسر عبدالحامد، پروفیسر عطیہ نشاط، پروفیسر نوشابہ سردار، ڈاکٹر شبنم حمید، ڈاکٹر فاضل ہاشمی، عزیزہ بانو، ڈاکٹر نگینہ جبیں، ڈاکٹر نغمہ پروین کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں ریسرچ اسکالر عبدالحی، محمد منظر، نفیس، شاہنواز، عصمت نیلو انصاری، شائستہ اقبال، عارفہ بیگم، حنا اکرام، احسان حسن وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

(ہمارا سماج، دہلی)

سالانہ غالب انعامات کا اعلان
اردو شاعری کے لیے مخمور سعیدی منتخب

● نئی دہلی۔ 10 نومبر، غالب انسٹی ٹیوٹ نے سالانہ غالب انعامات کا اعلان کر دیا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال دانشوروں، ادیبوں، شاعروں کو یہ ایوارڈ دیتا ہے۔ 2009 میں جن لوگوں کو اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے ان کے نام اس طرح ہیں: فخر الدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تنقید و تحقیق پروفیسر انصار اللہ (علی گڑھ)، فخر الدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تنقید و تحقیق پروفیسر اختر مہدی (دہلی)، غالب انعام برائے اردو شاعری جناب مخمور سعیدی (دہلی)، غالب انعام برائے اردو نثر پروفیسر عبدالستار دلوی (ممبئی)، ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ/ صحافت جناب حسن کمال (ممبئی)، غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات جناب نندکشور وکرم (دہلی)، غالب انعام برائے اردو خدمات جناب چودھری محمد نعیم (امریکہ)۔ یہ انعامات مبلغ پچاس ہزار روپے نقد، ایک تمغہ اور سند پر مشتمل ہیں۔ یہ انعامات 11 دسمبر کو جشن غالب تقریبات کے افتتاحی جلسے کے موقع پر پیش کیے جائیں گے۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

شہریار کو بیگم اختر غزل ایوارڈ

● مشہور اردو شاعر شہریار کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے لیے کلادھری بیگم اختر غزل اکادمی کی طرف سے 2009 کا غزل ایوارڈ 30 اکتوبر کو پونے میں دیا گیا۔ شہریار کو ایوارڈ مراٹھی کے مشہور ڈرامہ نگار، ادیب اور مورخ بابا صاحب پرندرے نے دیا۔ یہ ایوارڈ 25000 ہزار روپے کے چیک، ایک شال اور توصیف نامے پر مشتمل تھا۔

(ڈاک سے)

صمدانی کمپیوٹر سنٹر حیدرآباد کا جلسہ تقسیم اسناد

● حیدرآباد۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے قائم صمدانی کمپیوٹرائزڈ، کیلی گرافی ٹریننگ سنٹر عثمان باغ، بہادر پورہ حیدرآباد میں جاری ایک سالہ ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کورس میں کامیاب طلبہ و طالبات کے اعزاز میں جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات زیر صدارت مولانا خلیل احمد ندوی، چیئرمین صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی منعقد ہوا جس میں شہر

حیدرآباد کی مشہور شخصیتیں مولانا محمد حمیدالدین عاقل حسامی، مولانا مفتی خلیل احمد، جناب عبدالرحیم قریشی ایڈوکیٹ اور جناب سلیمان سکندر نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ صدانی ایجوکیشنل سوسائٹی کے تحت چلنے والے ادارے صدانی کالج آف ڈنٹس ایجوکیشن ملحقہ کاکتیہ یونیورسٹی، صدانی کالج آف اسلامک اسٹڈیز برائے خواتین، صدانی لینگوئجس سنٹر ملحقہ قومی اردو کونسل اور براہم ہائی اسکول مسلمہ حکومت اے پی وغیرہ کے طلبہ و طالبات اور دیگر حاضرین پر مشتمل اس جلسے کو مہمانان خصوصی نے مخاطب کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کی جانب سے زبان اردو اور اردو داں طبقے کے لیے کی جانے والی عظیم خدمات کو سراہا انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے طول وعرض میں وسیع پیمانے پر کمپیوٹر سنٹرز کا جال بچھا کر اردو کونسل نے اردو داں طبقے کے لیے روزگار کے لاتعداد مواقع فراہم کیے۔ مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے آنے کی ضرورت ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو نہ صرف تعلیم کی طرف متوجہ کیا بلکہ حصول علم کو فرض قرار دیا ہے۔ تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ فکر وشعور کے دائرے کی وسعت اور بصارت کے ساتھ بصیرت کا جوڑ ہے، تعلیم کے ذریعے حاصل ہونے والی صلاحیتیں ایسی طاقت ہوتی ہیں جو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کے کام آتی ہیں۔ تعلیم کے ذریعے علم کا خزانہ اپنے اندر جمع کرنا بجائے خود عظیم مقصد ہے لیکن اب تعلیم سے منفعت حاصل کرنا بھی اس کے مقاصد میں شامل ہوگیا ہے، آج فنی تعلیم کا جال بچھ گیا ہے، کمپیوٹر کے حوالے سے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے حصول کا عام ماحول بنتا جارہا ہے، آج کمپیوٹر نے زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرلیا ہے، دینی تعلیم سے آراستہ اصحاب کو بھی اس سے مفر نہیں، اس لیے اس کا سیکھنا ہر ایک کی ضرورت بن گیا ہے، قومی اردو کونسل نے اردو زبان کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑ کر ہمارے نوجوانوں کے لیے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، صدانی ایجوکیشنل سوسائٹی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے کمپیوٹر سنٹر ولینگوئجس سنٹر قائم کرکے اس پسماندہ علاقے کے طلبہ کو کمپیوٹر ٹریننگ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی عملی دنیا میں مطلوب پروگراموں سے آراستہ کرتے ہوئے ان کو روزگار سے جوڑنے کی جو کوشش کی ہے وہ یقیناً یہ ایک مستحسن اقدام ہے۔ ضرورت مندوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے اس کے لیے سوسائٹی کے ذمے داران وکارکنان صرف ذرائع ابلاغ کی تشہیر پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ میدانی سرگرمیوں پر بھی محنت کرتے ہیں۔ جناب محمد انورالدین نظامی انچارج صدانی کمپیوٹر سنٹر نے استقبال کیا، ڈاکٹر لئیق احمد سوپر وائزر سنٹر نے رپورٹ پیش کی، توفیق احمد صدیقی نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا، مہمانان خصوصی کے ہاتھوں کامیاب طلبہ و طالبات میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے جاری اسناد تقسیم کی گئیں۔ امتیازی کامیاب طلبہ کو شیلڈ، مومنٹو، میڈل اور دیگر انعامات کے ذریعے تہنیت پیش کی گئی۔ (ڈاک سے)

غیر منقوط شعری مجموعہ

● رامپور۔ 3 نومبر، رامپور کے ایک پرائمری اسکول ٹیچر وقار الحسنین نے 130 صفحات پر مشتمل اردو شاعری کی ایک ایسی کتاب تحریر کی ہے جس میں صرف 14 حروف تہجی کا استعمال کیا گیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کتاب میں نقطے کا کہیں بھی استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل میں دس سال کا طویل عرصہ لگا۔ وقار الحسنین نے اس کتاب کا نام ''مساعی حلم'' رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 14 حروف ہی استعمال ہو سکے۔ وقار الحسنین کے بقول انھوں نے جب اس کتاب کو لکھنے کا آغاز کیا تھا تب ان کی عمر 54 سال تھی۔ ایک بار انھیں لگا کہ وہ اس کی تکمیل نہ کرسکیں گے۔ لیکن جب یہ اپنے آخری مرحلے پر پہنچی تو انھیں اپنی اس کوشش پر خوشی کے ساتھ فخر بھی ہوا۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں غزلیں شامل ہیں جب کہ دوسرا حصہ دوہوں پر مشتمل ہے۔ ان نظموں کا محور ومرکز محبوبہ سے جدا ہونے والے عاشق کے دلی جذبات ہیں جن کا بیان مختلف حوالوں سے کیا گیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مختصرات

● امروہہ۔ 3 اکتوبر، ڈاکٹر تقی عابدی کی ہندوستان آمد پر امروہہ میں ہمارے نمائندے نے ان سے ملاقات کی جس میں ڈاکٹر تقی عابدی نے اردو ادب کے حوالے سے کہا کہ اردو زبان نہ صرف برصغیر کے ہندو پاک میں اپنی مقبولیت بڑھا رہی ہے بلکہ اردو کے چاہنے والے اس ملک کے علاوہ بھی تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جو اس زبان کی ترقی کے لیے کام انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی نے مزید کہا کہ اردو زبان صرف زبان نہیں ہے بلکہ ایک تہذیب ہے، جس میں ڈھل کر انسان کو زندگی جینے کا سلیقہ آتا ہے اور انسان ایک ایسی زندگی جیتا ہے جو ایک بہتر سماج بنانے کے لیے ضروری ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تقریباً 50 کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی تمام کتب نیٹ پر آن لائن موجود ہیں۔ اردو اخبارات کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ مغربی ہندوستان میں اردو اخبارات کا حال قابل اطمینان ہے۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● مظفرنگر۔ اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن مظفرنگر کی جانب سے آج 12 بجے ''اردو تعلیمی کنونشن'' سادات ہوسٹل میں منعقد ہوا جس کی صدارت جناب مولانا عابد حسین نے کی اور نظامت ماسٹر شعیب نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر جناب روی دت (بی.ایس.اے.) نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز

تلاوت کلام پاک سے ہوا اور نعت پاک رضوان جگر نے پیش کی۔ کنونشن میں مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو کی تعلیم پر زور دیا اور کہا کہ ہمیں اردو مضمون پڑھانے کے لیے سرکاری اردو کی کتابوں کے بھروسے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ اگر ہمیں اردو مضمون پڑھانا ہے تو بازار سے پرائیویٹ کتب خرید کر اردو پڑھائیں۔ اردو انواوک ویلفیئر سوسائٹی اتر پردیش کے صوبائی نائب صدر تحسین علی نے کہا کہ اردو زبان کو اگر ترقی دینی ہے تو اردو کو اپنے روزمرّہ کے کاموں میں استعمال کریں۔ اپنی مادری زبان کو اپنے گھروں میں زندہ رکھنے کے لیے اردو کی کتب، اخبار، رسائل وغیرہ کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اپنے بچوں کو اس کی ترغیب دینی چاہیے۔ اردو ٹیچر ویلفیئر سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ماسٹر شہزاد علی نے تنظیم کے اغراض و مقاصد پڑھ کر سنائے اور ضلع میں اردو اساتذہ کے درپیش آرہی پریشانی اور خالی پڑی اردو اساتذہ کی اسامیوں پر تقرری کیے جانے اور دیگر مضمونوں کی ٹریننگ کی طرح اردو مضمون کی ٹریننگ بھی دینے کی مانگ بی. ایس.اے. کے سامنے رکھی۔ مہمانِ خصوصی جناب روی دت (بی.ایس.اے.مظفرنگر) نے اردو اساتذہ کو درپیش مسائل کو حل کرنے کی یقین دہانی کرائی اور اردو تعلیمی کنونشن کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے منتظمین کو مبارک باد پیش کی۔ ضلع صدر جناب رئیس الدین رانا نے پروگرام میں تشریف لائے تمام مہمانان کرام اور اساتذہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کنونشن میں پورے ضلع سے اردو اساتذہ نے شرکت کی۔ جن میں خاص طور سے فصیح الدین (اردو مترجم بی.ایس.اے.)، ماسٹر محمد اخلاق، ماسٹر ریاض، ماسٹر شبیر، محترمہ شبانہ پروین، ماسٹر شکیل احمد، ماسٹر فضل الرحمٰن، سہیل، شہزاد علی محبوب عالم، شفیق الرحمٰن، صابر خان (کنوینر میرٹھ)، قصیب الدین، اشور سنگھ، سنجیو بالیان، ستیش بالیان، راجندر سنگھ بھاری وغیرہ شامل تھے۔ (اخبار مشرق، دہلی)

● سرینگر۔ 25 اکتوبر، اردو اکادمی جموں و کشمیر کی جانب سے کینی مشن اسکول سرینگر میں ایک ادبی محفل کا اہتمام کیا گیا۔ یہ پررونق محفل دو نشستوں پر مشتمل تھی۔ پہلی نشست میں جاوید انور کی ادارت میں بنارس سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ''تحریک ادب'' کے خصوصی شمارے گوشۂ رفیق راز کی رسم رونمائی انجام دی گئی جبکہ دوسری نشست میں مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ پہلی نشست کی صدارت اردو اکادمی کے سرپرست پروفیسر حامدی کاشمیری نے کی جبکہ جاوید انور بحیثیت مہمان خصوصی اور رفیق راز مہمان اعزازی کی حیثیت سے شریک تھے۔ اس نشست کی نظامت کے فرائض سید مبشر رفاعی نے انجام دیے۔ اکادمی کے صدر نور شاہ نے اپنے استقبالیہ خطبے میں اردو اکادمی کی کارکردگی کا مفصل خاکہ پیش کیا۔ پروفیسر حامدی کاشمیری نے اپنے صدارتی خطبے میں نوجوان ادیب جاوید انور کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ جہاں ایک طرف اردو زبان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہیں جاوید انور جیسے نوجوان ادیبوں اور قلم کاروں کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔ انھوں نے میڈیا سے شکوہ کیا کہ وہ ادب اور ادیب کو فراموش کر کے غیر ضروری خبروں کو ترجیح دیتا ہے۔ رفیق راز اور جاوید انور نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس نشست کے اختتام پر اردو اکادمی کے جنرل سکریٹری جاوید ماتجی نے شکریے کی تحریک پیش کی۔ دوسری نشست کی صدارت بزرگ شاعر سلطان الحق شہیدی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض سید مبشر رفاعی نے انجام دیے۔ اس نشست میں جن شعرا نے اپنا کلام پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا ان میں رؤف راحت، سلیم ساغر، سید مبشر رفاعی، وحید مسافر، حسن انظر، امداد ساقی، نذیر احمد نظیر، ڈاکٹر شفق سوپوری، ڈاکٹر نذیر آزاد، جاوید انور، رفیق راز، مظفر ایرج، ہمدم کاشمیری اور سلطان الحق شہیدی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

(صحافت، دہلی)

● پونے۔ پونے میں اردو ساہتیہ پریشد کے زیر اہتمام ایک ادبی مجلس منعقد ہوئی۔ اس میں مہاراشٹر بھر سے آئے ہوئے ادبا، شعرا اور دانشور شریک تھے۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے اسمبلی ہال میں اردو ویب سائیٹ کا اجرا قاضی مشتاق احمد کے ہاتھوں ہوا۔ اس کے بعد سید آصف کی نظموں پر مبنی سی.ڈی. کا اجرا حاجی اقبال صاحب نے فرمایا۔ اس کا نام ''شناخت'' ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے شناخت کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اسے جدید شاعری میں قابل قدر اضافہ قرار دیا۔ مجلس کے صدر منور پیر بھائی نے سید آصف کو گلہائے تہنیت پیش کیے۔ دسمبر میں منعقد ہونے والے دو روزہ ادبی اجلاس کے منتخبہ صدر جناب قاضی مشتاق احمد کی پذیرائی کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو کی صدر محترمہ ممتاز پیر بھائی نے کہا کہ قاضی صاحب اردو دنیا کے ایک مقبول اور ہر دلعزیز ادیب ہیں موصوف نے اپنے زور قلم سے جو عزت و احترام حاصل کیا ہے وہ قابل رشک ہے۔ منور پیر بھائی نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو زبان کی مجموعی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو نے قومی یکجہتی اور وطن پرستی کے جذبے کو فروغ دینے میں نمایاں کامیاب حاصل کی ہے۔ ضلع یونٹ کے صدر نور منیری نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا تعارف بھی پیش کیا۔ نظامت کے فرائض رفیق قاضی نے انجام دیے۔

دوسرے سیشن میں آل مہاراشٹر شاعرہ نور منیری کی صدارت میں ہوا۔

اختتامی اجلاس میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے شمیم عباس نے اردو ساہتیہ پریشد کی خدمات کو سراہتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ سیکڑوں غیر اردو داں حضرات اردو سیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ لہٰذا پریشد انھیں اردو سکھانے کے کام میں بھی دلچسپی لے جناب قاضی مشتاق احمد نے دو روزہ اجلاس کی

صدارت کے لیے انتخاب پر ممبران کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ پمپری چنچوڑ کے علاقے میں منعقد ہونے والے اس اجلاس سے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ راج اہیر راؤ کے اظہار تشکر پر مجلس کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

موسوعہ فقہیہ

● نئی دہلی۔ 23 اکتوبر، ہندوستان اور کویت کے تعلقات بہت پرانے اور دوستانہ ہیں۔ ان میں آج ثقافتی تعلقات کی ایک نئی کڑی جڑ گئی ہے۔ کیونکہ کویت میں مرتب ہونے والی انتہائی اہم کتاب ''موسوعہ فقہیہ'' کو اردو میں ترجمہ کرکے ہندوستانیوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس سے مدارس اور یونیورسٹیوں کے طلبہ استفادہ کرسکیں گے۔ ان خیالات کا اظہار آج انڈیا اسلامک کلچر سینٹر میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے زیر اہتمام منعقد تقریب میں نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری نے ''موسوعہ فقہیہ'' کے اردو ترجمے کا اجرا کرتے ہوئے کہا۔

حامد انصاری نے مزید کہا کہ مسلمانوں کی زندگی میں فقہ کی بہت اہمیت ہے۔ عالم اور فقیہہ دونوں مل کر ہی زندگی کے اہم مسائل کو تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج دنیا میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں اور مسلمان دنیا کے ہر کونے میں موجود ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں جو نئے مسائل سامنے آتے ہیں ان کا جواب فقہ سے کیسے حاصل کیا جائے۔ اس لیے آج فقہیہ پر بہت بڑی ذمے داری عاید ہوگئی ہے۔ حامد انصاری نے کہا کہ جس طرح دینی طور پر ایک اچھا مسلمان ہونا ضروری ہے ویسے ہی جہاں آپ رہتے ہیں وہاں کا اچھا شہری ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ہم معاشرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔

اس سے قبل اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے جنرل سکریٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے موسوعہ الفقہیہ کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس کتاب کی 45 جلدوں کا اردو میں ترجمہ کرنے میں دس سال لگ گئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ اس کتاب کا سب سے پہلا ترجمہ اردو میں ہوا ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا جلال الدین عمری نے کہا کہ اس کتاب میں مختلف فکری مسائل کا حل یکجا کردیا گیا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ جس کو جہاں آسان حل نظر آئے گا وہ اسے اپنا لے گا۔ تقریب کی صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر مولانا محمد سالم قاسمی نے کی۔ اس موقع پر سعودی عرب کے سفیر فیصل بن حسن، کویت کے سفیر سامع محمد السلیمان، کویت کے ڈاکٹر فالح بدر اعظمی، ڈاکٹر خالد شعیب، ڈاکٹر بدر حسنین اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

بیگم سمرو — حیات اور ان کی وراثت

● نئی دہلی۔ 15 اکتوبر، جامعہ ملیہ اسلامیہ واقع تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز کے آڈیٹوریم میں ایک پروقار تقریب منعقد کی گئی جس کی صدارت جامعہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر پریتی شرما کی کتاب ''بیگم سمرو — حیات اور ان کی وراثت'' کی رسم اجرا تھرڈ ورلڈ اکیڈمی کے ڈائرکٹر پروفیسر مشیر الحسن کے ہاتھوں ادا کی گئی۔ پروفیسر مشیر الحسن نے بیگم سمرو کو اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی اہم شخصیت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ بیگم سمرو نے ایک چھوٹے سے شہر سردھنہ میں قومی یکجہتی کو فروغ دیا۔ پروفیسر امت مکھرجی، صدر شعبۂ تاریخ سینٹ جونس کالج آگرہ، مکل کیشون شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ڈاکٹر جاوید نے بیگم سمرو کے کارناموں پر روشنی ڈالی اور ڈاکٹر پریتی شرما کو اس کام کے لیے مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ بیگم سمرو نے سردھنہ میں مختلف میدان میں اہم کارنامے انجام دیے۔ پروفیسر محمد عزیز الدین حسین ہمدانی ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ لینگویجز نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور آخر میں مقررین، اساتذہ اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ارمغان سالار

● بنگلور۔ 10 اکتوبر، (منیر احمد آزاد، سینئر رپورٹر) الامین ایجوکیشنل سوسائٹی بنگلور کے زیر اہتمام آج شام الامین کالج کیمپس روڈ بنگلور میں جناب عتیق احمد صدر، سالار پبلی کیشنز ٹرسٹ نے پروفیسر بی شیخ علی کی کتاب ''ارمغان سالار'' کا اجرا کیا۔ جناب عتیق احمد نے کہا کہ 1999 میں روزنامہ سالار اور سالار ویکلی کے مدیر اعلیٰ مقصود علی خان صاحب اپنے خالق حقیقی سے جاملے تو ادارے میں ایک خلا پیدا ہوگیا۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے ایک قابل اور موزوں شخص کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر نظر انتخاب پروفیسر بی شیخ علی صاحب پر پڑی اپنی مصروفیات کے باوجود انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ ہماری پیش کش کو قبول فرمایا تاحال روزنامہ سالار اور سالار ویکلی کے مدیر اعلیٰ کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں اور اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ''ارمغان سالار'' کا اجرا کرتے ہوئے مجھے بہت مسرت ہورہی ہے اس کتاب میں مضامین کا ایک انتخاب شامل ہے جو مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے آپ وقتاً فوقتاً خاص خاص موقعوں پر لکھتے رہے ہیں اور یہ مضامین اخبار میں ''اداریہ'' کالم کی بجائے عموماً ''مدیر اعلیٰ کے قلم سے'' عنوان کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔

(سالار، بنگلور)

رنگے ہاتھوں

● حیدرآباد۔ 10اکتوبر، جناب خان لطیف محمد خاں ایڈیٹر انچیف روزنامہ منصف نے کہا ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں طنز ومزاح کو ایک خاص مقام حاصل ہے لیکن اردو دنیا کی وہ واحد زبان ہے جس کے طنز ومزاح کے مضامین کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ جناب خان لطیف محمد خان آج شام حمید عادل کی تصنیف کردہ کتاب ''رنگے ہاتھوں'' کی رسم اجرا انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ طنز ومزاح کے مصنفین نے نثر نگاری میں اپنے خاص نقوش چھوڑے ہیں۔ حمید عادل بھی نئی نسل کے کالم نگار ہیں۔ جنھوں نے روزنامہ ''منصف'' میں طنز ومزاح سے بھرپور کالم نگاری شروع کی اور ان ہی مضامین کو کتابی شکل دی گئی۔ ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ یہ اردو صحافت کی دین ہے کہ اس نے طنز ومزاح کے بڑے بڑے کالم نگار پیدا کیے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، شاہد صدیقی، یوسف ناظم، مسیح انجم، عباس متقی نے طنز ومزاح کی نثر نگاری میں اپنا ایک خاص مقام بنایا ہے۔ حمید عادل بھی اس سلسلے کی کڑی ہیں حیدرآباد کے اردو اخبارات بالخصوص منصف قابل ستائش ہے جس نے طنز ومزاح کے نئے کالم نگار پیدا کیے۔ طنز ومزاح کے شاعر طالب خوندمیری نے کہا کہ طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری ایک مشکل کام ہے لیکن اس کی ایک ایک بات عام آدمی کے دل میں فوری اتر جاتی ہے۔ ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے کہا کہ اودھ پنچ پہلا اردو اخبار ہے جس نے کالم نگاری کو فروغ دیا۔ اردو میں مزاحیہ نگاری کے بعد ہی سنجیدہ کالم نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ سنجیدہ کالم نگاری آسان ہے لیکن طنز ومزاح سے بھرپور نثر نگاری بہت مشکل کام ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ حمید عادل طنز ومزاح میں نثر نگاری کے فن کو مستقبل میں بلندیوں پر پہنچائیں گے۔ جناب رشید انصاری نے حمید عادل کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے فن کا لوہا منوانے کے لیے اپنے دائرے کو وسیع کریں۔ آخر میں حمید عادل نے اپنی تیسری تصنیف ''رنگے ہاتھوں'' کی رسم اجرائی کے لیے خاں لطیف محمد خاں اور ممتاز مزاح نگاروں اور شرکائے تقریب سے اظہار تشکر کیا۔ (منصف، حیدرآباد)

راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی

● ٹونک۔ 25اکتوبر، آج دن کے 11 بجے دارالعلوم خلیلیہ ٹونک میں انجمن ترقی اردو (ہند) ضلع ٹونک کے زیراہتمام ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر قمر جہاں صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج کوٹہ کی کتاب ''راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی 1857 سے 1957 تک کا اجرا کیا گیا۔ پروگرام میں ٹونک کے علاوہ دیگر شہروں سے بھی لوگوں نے شرکت کی۔ پروگرام کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، صدر صاحبزادہ شوکت علی خاں اور مہمانانِ اعزازی ڈاکٹر عارفہ سلطانہ، صاحبزادہ عبدالمعید خاں ڈائرکٹر عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تھے۔ پروگرام کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے کتاب کا اجرا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

انقلاب آنے کو ہے

● سہارنپور۔ 24اکتوبر، انجمن زندہ دلان سہارنپور کے زیراہتمام آصف شمسی کے پہلے مجموعۂ کلام ''انقلاب آنے کو ہے'' کا اجرا سہارنپور رینج کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس پی کے شریواستو کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس تقریب کی صدارت سوامی رام تیرتھ کیندر کے سنچالک ڈاکٹر کیدارناتھ پربھاکر نے فرمائی۔ مہمانان ذی وقار میں حاجی فضل الرحمٰن قریشی، اجے جین، سشما بجاج، انیس شمسی شامل تھے۔ نظامت راؤ محبوب اور عاصم پیرزادہ نے مشترکہ طور پر چلائی۔ ہوٹل اسکائی لارک کے خوبصورت ہال میں رسم اجرا کا آغاز انجمن کے خازن رحمٰن عزیز نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ بلاسم اسکول کی طالبہ عصمت زہرا نے نعت پاک پیش کی۔ آصف شمسی کی غزل اپنی مترنم آواز میں راحیلہ متین، پرہلاد آتش نے پیش کی۔ آصف شمسی کی شاعری پر اظہار خیال کرنے والوں میں شاہد زبیری، پروفیسر جلال عمر، پروفیسر یوگیش چھبر، حاجی فضل الرحمٰن قریشی، دہاج الحق، کاشف، اجے جین (بیٹ والے) اور کے پی پانڈے تھے۔

سیکولرزم کا تصور اردو سے جڑا ہے۔ اس لیے اس کے فروغ کو عملی جامہ پہنائیں۔ انھوں نے کہا کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی میں ادیبوں اور شاعروں نے جو اہم کردار ادا کیا ہے اس کی آج بھی ضرورت ہے۔

(صحافت، دہلی)

وفیات

وحید قریشی

● نئی دہلی۔ 19اکتوبر، اردو کے عالمی شہرت یافتہ محقق ڈاکٹر وحید قریشی کا 17اکتوبر کو لاہور میں انتقال ہوگیا۔ ان کی ولادت 14فروری 1925 کو میانوالی میں ہوئی۔ وہ اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے۔ انھوں نے اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی لاہور (پاکستان) سے 1940 میں میٹرک پاس کیا۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ ان میں بچپن ہی سے ادبی ذوق تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے فارسی میں پی ایچ ڈی اور اردو میں ڈی لٹ کیا۔ بہت سے رسالوں میں ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان کی تقریباً

پچیس مطبوعات ہیں۔ جن میں شبلی کی حیات معاشقہ، مثنوی سحرالبیان (مرتب) مطالعۂ حالی۔ مقالات تحقیق، میر حسن اور ان کا زمانہ کو بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

پربھاش جوشی

● نئی دہلی۔ سینئر صحافی پربھاش جوشی کا کل رات یہاں دل کا دورہ پڑنے کے سبب انتقال ہوگیا۔ وہ 73 سال کے تھے۔ رشتہ داروں نے بتایا کہ کل رات ہندوستان اور آسٹریلیا کے درمیان پانچواں ایک روزہ میچ دیکھتے وقت مسٹر جوشی کے سینے میں تکلیف ہوئی۔ انھیں پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے انھیں مردہ قرار دے دیا۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے، ایک بیٹی اور ماں لیلا بائی ہیں۔ اخبار ''نئی دنیا'' سے اپنی صحافت کی ابتدا کرنے والے مسٹر جوشی نے ایڈیٹر کے طور پر اخبار ''جن ستا'' کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ 1995 میں ایڈیٹر کے عہدے سے ریٹائرمنٹ لینے کے بعد بھی وہ مشیر چیف ایڈیٹر کے طور پر جن ستا سے منسلک رہے۔ انھوں نے انگریزی اخبار انڈین ایکسپریس کے مقامی ایڈیٹر کے طور پر بھی دہلی، احمد آباد اور چنڈی گڑھ میں کام کیا۔ آخری دیدار کے لیے ان کا جسد خاکی غازی آباد کے وسندھرا میں جن ستا اپارٹمنٹ میں رکھا گیا ہے۔ مسٹر جوشی کی آخری رسومات ان کی خواہش کے مطابق اندور کے نزدیک نربدا کے کنارے ادا کی جائیں گی۔ جنتا دل (سیکور) کے صدر اور سابق وزیراعظم ایچ ڈی دیوے گوڑا ہریانہ کے گورنر جگن ناتھ پہاڑیا، وزیراعلیٰ بھوپندر سنگھ ہڈا اور دیگر کئی اہم سیاسی شخصیتوں نے مسٹر جوشی کے انتقال پر دلی رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔

رحمٰن نیر

● نئی دہلی۔ دہلی کی معروف ادبی وسماجی شخصیت اور ماہنامہ بیسویں صدی کے ایڈیٹر ضیاء الرحمٰن نیر کا گزشتہ شب دوران علاج ایمس میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین بستی حضرت نظام الدین کے قبرستان پنج پیران میں عمل میں آئی۔ واضح رہے کہ رحمان نیر نے بیسویں صدی کے مالک ومدیر کی حیثیت سے عرصۂ دراز تک گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ دہلی کی سماجی زندگی میں بھی ایک فعال ومتحرک شخصیت کی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتے تھے اور ان کی کمی عرصۂ دراز تک محسوس کی جائے گی۔ مرحوم کی عمر تقریباً 73 سال تھی۔ واضح رہے کہ کسی زمانے میں مرحوم کے جلو میں شاعروں اور ادیبوں کا جم گھٹ رہا کرتا تھا لیکن آج ان کی تدفین میں دہلی کے ادبا اور شعرا نیز قابل ذکر سماجی وسیاسی شخصیات کی کمی محسوس کی گئی۔

ہمایوں ظفر زیدی

● نئی دہلی۔ 19 اکتوبر، معروف ادیب وشاعر اور شعبۂ انگریزی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر ہمایوں ظفر زیدی کا آج طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ حالانکہ وہ انگریزی کے استاد تھے لیکن انھوں نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر سلامت اللہ، پروفیسر فراق گورکھ پوری اور پروفیسر کلیم الدین احمد جیسے ادیبوں کی طرح اردو کی خدمت انجام دی۔ واضح رہے کہ آج صبح دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ کیلاش ہاسپٹل نوئیڈا میں زیر علاج تھے۔ ان کی تدفین ان کے آبائی وطن پہانی ہردوئی یوپی میں کل کی جائے گی۔ پسماندگان میں ان کی اہلیہ، بیٹے حسن، حسین اور سجاد ہیں۔ پروفیسر ہمایوں ظفر زیدی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ مدینہ یونیورسٹی اور مسکت یونیورسٹی میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ ان کے کئی مضامین انگریزی اور اردو کے رسائل میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔ پروفیسر ہمایوں ظفر زیدی طالب علمی کے زمانے سے لے کر آخری دنوں تک اردو کے لیے کام کرتے رہے۔

اختر عادل روپ

● بریلی۔ 18 اکتوبر، اردو کے مشہور افسانہ وناول نگار اختر عادل روپ کا یہاں سنیچر کی صبح دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 74 برس کے تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو فرزند مجتبیٰ عادل اور مرتضیٰ عادل ہیں۔ اختر عادل ادبی دنیا میں اختر عادل روپ کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ وہ چھٹی دہائی کے مقبول ترین فکشن نگاروں میں شامل تھے جب گلشن نندہ، عادل رشید، عارف مارہروی، دت بھارتی اور مضطر ہاشمی کی طرح اختر عادل روپ بھی ایک جانا پہچانا نام تھا۔ آخری رات، اندھیرے، جانے والے اور پھول ان کے مشہور ناول تھے۔ اختر عادل 1935 میں بریلی میں پیدا ہوئے اور آگرہ میں کیندریہ ودیالیہ سے انگریزی کے استاد کے طور پر ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ عرصے سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ سنیچر کی شام ہی بریلی کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ادیبوں اور صحافیوں کے ایک بڑے حلقے نے ان کے انتقال پر اظہار تعزیت کیا۔

□□□

تبصرہ وتعارف

"دور بین" 34 مختصر کہانیاں

مترجم: شمیمہ بیگم

صفحات: 247، **قیمت:** -/85 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: عارف عثمانی، جی۔63، ہلال ہاؤس، مرادی روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25

بچے قوم کی امانت ہیں، کسی قوم کا مستقبل اس قوم کے بچوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ بچے مستقبل کے معمار ہوتے ہیں اس طرح کے جملے اکثر بچوں کے لیے سنے جاتے ہیں اور سچائی بھی یہی ہے کہ بچے قوم وملک کی امانت اور اس کا اثاثہ ہوتے ہیں، اسی لیے ان کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے، ان کی شخصیت میں نکھار پیدا کیا جاتا ہے، جب بچے کی ہمہ جہتی نشو ونما کی بات کی جاتی ہے تو مقصد تعلیم وتربیت کے ذریعے اس کی کردار سازی ہوتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے درسی کتابوں کے علاوہ، ایسی دوسری معاون چیزوں پر بھی توجہ دی جاتی ہے، جو بچے کے شوق اور اس کی دلچسپی سے تعلق رکھتی ہیں۔ کہانیوں کو بھی بچے بہت پسند کرتے ہیں۔ کہانی کہنا اور لکھنا دونوں ایک آرٹ ہے۔ کمپیوٹر کے دور میں بھی بچوں کے لیے کہانی کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ دادی اور نانی کی زبانی ان کے مخصوص لب ولہجہ میں کہانیوں کا سننا بچوں کو بہت بھاتا ہے۔

بچوں کے لیے کہانی لکھنا سہل کام نہیں اس کے کچھ الگ تقاضے ہیں ان تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کہانی لکھی جائے گی تبھی وہ مقبول بھی ہوگی اور موثر بھی۔ پیش نظر کتاب "دور بین" بچوں کے لیے چونتیس (34) مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے یہ کہانیاں بچوں کی نفسیات اور ان کی دلچسپی کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ کتاب اولاً چلڈرن بک ٹرسٹ کی طرف سے انگریزی زبان میں 1991 میں شائع ہوئی تھی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اسے اب اردو میں شائع کیا ہے، مترجم شمیمہ بیگم ہیں۔ یقیناً یہ کوشش قابلِ صد ستائش ہے۔ انگریزی جیسی ترقی یافتہ زبان کی اچھی تخلیقات کو اپنی زبان میں ڈھال کر پیش کرنا اہمیت کا حامل ہے۔

247 صفحات پر مشتمل یہ 34 کہانیاں ان علاقوں، اور اس تمدنی ماحول کی آئینہ دار ہیں جس سے اردو پڑھنے والے بچے ناواقف ہیں اس طرح یہ کہانیاں ان کی دلچسپی کا سامان کرنے کے علاوہ ان کی معلومات میں بھی اضافہ کریں گی، ان کہانیوں کے عنوان بڑے ہی دلچسپ ہیں، مثلاً "ہمیشہ دیر سے آنے والی لڑکی"، "اندھیرے سے ڈرتا کون ہے"، "بادشاہ کون"، "نیلی ریل گاڑی"، "ان ہونی" وغیرہ وغیرہ سبھی کہانیاں سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ پُر اثر بھی ہیں جن میں کرداروں اور واقعات کے ذریعے علاقائیت کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

"ہمیشہ دیر سے آنے والی لڑکی" میں ایسی لڑکی کی کہانی پیش کی گئی ہے جو ہر کام تاخیر سے کرنے کی عادی ہے اس کی یہ عادت اسے اکثر پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آخر میں وہ اس عادت سے توبہ کر لیتی ہے۔ اسی طرح اندھیرے سے ڈرتا کون ہے۔ ایک ایسے بچے کی کہانی ہے جو ہمیشہ اندھیرے سے ڈرتا اور کانپتا ہے، پکنک کے موقع پر وہ ایک ایسے بچے کو اپنا ساتھی بناتا ہے جو بڑا بہادر، اور طاقتور سمجھا جاتا ہے، لیکن وقت آنے پر وہ بہادر سب سے زیادہ بزدل اور اندھیرے سے ڈرنے والا ثابت ہوتا ہے، اس طرح پہلا بچہ اپنے ڈر سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ کہانی "ان ہونی" میں شیکھنی گوندنی نے ایک چڑیا کو وسیلہ بنا کر بچوں کو یہ سبق دیا ہے کہ ظاہری چمک دمک کبھی کبھی نقصان دہ ہوتی ہے، اس لیے انسان کو اسی حال میں خوش اور مطمئن رہنا چاہیے جو اس کو ملا ہے۔

امید ہے کہ کہانیوں کے اس دلکش اور دلچسپ مجموعے کو پڑھ کر بچے مسرت محسوس کریں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔

ہندوستان کی کہانیوں کا خزانہ

مصنف: شنکر، **مترجم:** خسرو متین

صفحات: 104، **قیمت:** -/37

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: عبدالرشید اعظمی، 306، کاویری ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-67

بچے ملک وقوم کا بیش بہا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت صرف ماں باپ کا فریضہ ہی نہیں قومی ذمے داری بھی ہے۔ ملک کا مستقبل انھی سے وابستہ ہوتا ہے۔ آج کے بچے کل کے بڑے ہوتے ہیں۔ یہی بچے ملک وقوم کے رہبر، سائنس داں، قانون داں موجد، فلسفی، مدبر اور سرحد کے نگہبان ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی تعلیم وتربیت اس نہج پر ہونی چاہیے کہ وہ گھر، خاندان، محلے، سماج اور ملک وقوم کے لیے کارآمد اور مددگار ثابت ہوں۔ بچے گیلی مٹی کے مانند ہوتے ہیں۔ جس شکل میں چاہو انھیں ڈھالا جاسکتا ہے۔

ماں باپ کی صحبت، گھر اور محلے کا ماحول، ان کے لیے سانچے کا کام کرتے ہیں۔ جیسا سانچا ہوگا وہ اس میں ڈھل جائیں گے۔

بچے کا پہلا مکتب ماں کی گود ہے اور اس مکتب سے حاصل شدہ تعلیم و تربیت اس کی فطرت اور جبلت کا حصہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا یہی تعلیم و تربیت آگے چل کر بچوں کی شخصیت کی تعمیر کی اساسی اینٹ ثابت ہوتی ہے۔

قومی اردو کونسل نے اپنے ایک منصوبے کے تحت بچوں کے لیے دلچسپ معلوماتی اور سبق آموز کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے کونسل نے اردو میں لکھی گئی کہانیوں کے علاوہ مختلف زبانوں کی کہانیوں کے تراجم اردو میں کرائے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ''ہندوستان کی کہانیوں کا خزانہ'' (حصہ اوّل) اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس کو قومی اردو کونسل نے ''چلڈرن بک ٹرسٹ'' اور ''بچوں کا ادبی ٹرسٹ'' کی معاونت سے شائع کیا ہے۔ اس میں کل بارہ کہانیاں ہیں۔ ہر کہانی سے کوئی نہ کوئی سبق ملتا ہے۔ ہر کہانی کسی الگ صوبے یا ریاست سے جڑی ہوئی ہے جس میں وہاں کے جغرافیائی ماحول، سماجی احوال، رسم و رواج اور عقیدوں کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ کچھ کہانیاں ایسی ہیں جن کی اساس ہندو میتھالوجی پر ہے۔ تاہم سماجی و اخلاقی افادیت سے بھری ہیں اور ایک مقام پر پہنچ کر قاری یا سامع کو دعوت فکر دیتی ہیں۔

کچھ کہانیوں کا اختتام مزاح پر ہوتا ہے۔ کہانی ''تقدیر بنام تدبیر'' بھی ہندو میتھالوجی پر مبنی ہے لیکن مجموعی طور پر ہندوستانی سماج کے گھریلو ماحول کو پیش کرتی ہے۔ کہانی میں دکھایا گیا ہے کہ یم لوک کا یم راج دنیا کی خوبصورتی سے متاثر ہوکر دنیا میں آنا چاہتا ہے۔ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک خوبصورت نوجوان کا روپ دھارتا ہے اور زمین پر آکر ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ جس سے اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے یم راج کام کاج میں مصروف رہتا ہے۔ بیوی کی فرمائشیں دن بہ دن بڑھتی جاتی ہیں۔ نتیجتاً گھر میں بے چینی راہ پالیتی ہے، گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی بک بک جھک جھک شروع کردیتی ہے۔ وہ بیوی کے ڈر سے گھر میں ادھر ادھر چھپتا پھرتا ہے۔ ایک دن موقع دیکھ کر اپنا پہلا روپ اختیار کرتا ہے اور یم لوک بھاگ جاتا ہے۔ کہانی کا خاتمہ ایک بہت ہی دلچسپ منظر پر ہوتا ہے۔ راجہ کی بیٹی سخت بیمار ہے۔ اس کی روح نکالنے کا حکم ہوجاتا ہے۔ یم لوک سے یم راج شہزادی کی روح نکالنے آتا ہے تو شہزادی کے سرہانے اپنی بیوی کو بیٹھا پاتا ہے وہ گھبرا کر الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اس طرح شہزادی کی جان بچ جاتی ہے۔

کتاب میں شامل سبھی کہانیاں سماج کے کسی نہ کسی پہلو کو محیط ہیں۔ انسان کے اندر پائی جانے والی اخلاقی بیماریوں مثلاً تکبر، نفرت، حرص، لالچ، بغض و حسد، غصہ، مکاری فریب کے عبرتناک انجام کو پراثر اسلوب میں پیش کیا گیا ہے تاکہ قاری کے اندر غیر اخلاقی حرکتوں اور بری عادتوں سے نفرت پیدا ہو۔ اچھے طور طریقے اختیار کرنے کا شوق پیدا ہو۔ کتاب کے زیادہ تر صفحات مصور ہیں۔ کہانی کی مناسبت سے تصویریں بنائی گئی ہیں۔

عقل مند مچھیرا

مرتب: م۔ندیم

صفحات: 48، قیمت: -/13

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی

مبصر: عائشہ شہناز فاطمہ، 309، گوداوری ہوسٹل، جے۔این۔یو، نئی دہلی

ماضی قریب میں گھر کے بزرگ سونے کے وقت اپنے گھر کے بچوں کو نصیحت آموز قصے سنایا کرتے تھے۔ اس کا مقصد ان کا دل بہلانے کے علاوہ بچوں کی تربیت ہوتا تھا۔ سوداگر، طوطے مینا، فقیر اور راجا رانی کے قصوں میں بچوں کی دلچسپی کے علاوہ، کچھ پیغام اور سبق بھی ہوا کرتا تھا۔ جیسے جیسے انسانی زندگی مصروف ہوتی گئی۔ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس کا اثر نئی نسلوں کی سوچ اور ان کی تخلیقی صلاحیت پر پڑا ہے۔ اب کہانیاں سننے سنانے کی جگہ ٹیلی ویژن دیکھنے دکھانے کا عام چلن ہوگیا ہے۔ جس کے سبب وہی چیزیں بچوں کو متاثر کررہی ہیں۔ جو فلموں میں یا ٹیلی ویژن پر دکھائی جاتی ہیں جن میں بچوں کی ذہنی او راخلاقی تربیت کا کچھ خاص خیال نہیں رکھا جاتا۔

معاشرتی تقاضوں کے مطابق تعلیم کی طرف رجحان بڑھا ہے لیکن اس پر مادیت کا پہلو غالب ہے۔ نتیجتاً خودغرضی اور نفس پرستی کو بڑھاوا ملا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرتی برائیاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ ایسے ماحول میں معاشرتی برائیوں کا احساس جگانے میں کتابیں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ جو دل بہلانے کے علاوہ نصیحت اور عبرت کا سامان فراہم کرسکتی ہیں۔ قومی اردو کونسل نے پچھلے دنوں کثیر تعداد میں کہانیوں اور قصوں کی کتابیں شائع کی ہیں۔ ''عقل مند مچھیرا'' ان میں سے ایک ہے۔ اس کے مرتب م۔ندیم نے چھوٹی چھوٹی سات کہانیوں کو ترتیب دے کر یہ مجموعہ تیار کیا ہے۔ مجموعے کا نام اس میں شامل ایک کہانی ''عقل مند مچھیرا'' سے لیا گیا ہے۔ اس کہانی میں رشوت خور دربان کو مچھیرے نے اپنے حسن تدبیر سے سزا دلوائی۔ دوسری کہانی کا عنوان ''چور'' ہے۔ دوسری کہانیوں کی طرح یہ کہانی بھی ڈرامائی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس میں دو منظر اور پانچ کردار ہیں۔ افضل میاں ایک ادھیڑ عمر کا رحم دل آدمی، دوسرا فضلو، افضل میاں کا نوکر، تیسرا چور چوتھا کوتوال او رپانچواں سپاہی

ہے۔اس کہانی کا اختتامی پوائنٹ افضل میاں کی رحم دلی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک چور، شریف انسان بن جاتا ہے۔ اس کہانی میں اچھے اوصاف کے اچھے نتائج برآمد ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔

''استاد اور شاگرد''، ''گدھے کی حجامت''، ''سچا دوست''، اور'' دور کا دوست'' کے عنوانات سے ان چاروں کہانیوں میں سماج کے اچھے برے دونوں پہلو پیش کیے گئے ہیں اور مختلف انسانی رویوں کو کرداروں کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ مجموعے کی آخری کہانی ''سخی حاتم'' ہے کہانی تو پرانی ہے لیکن پیشکش کا انداز نیا اور اچھوتا ہے۔ مرتب نے اس کہانی کو مختصر تر کر کے آٹھ کرداروں کے ذریعے تین منظر میں پیش کیا ہے۔ کردار بادشاہ سلامت، وزیراعظم، حاتم، لکڑہارا، اس کی بیوی، ڈھنڈورچی، سپاہی اور چند دیگر افراد ہیں۔ آغاز ایک بازار میں ڈھنڈورچی کی منادی سے ہوتا ہے۔ مرحلہ وار گزرتے ہوئے کہانی کے تیسرے منظر میں بادشاہ کا دربار دکھایا گیا ہے جہاں حاتم کو گرفتار کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ حاتم کی رہائی، لکڑہارے پر بادشاہ کی نوازش اور چھوٹے دعویداروں پر بادشاہ کے عتاب کو نہایت دلچسپ اور عبرت آموز اسلوب و انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کی چھپائی، سرورق اور رنگوں کا انتخاب دلکش ہے۔

موگھیا لوک کہانیاں

مرتب و مترجم: وقار صدیقی

صفحات: 96، قیمت: -/70 روپے

ناشر: نئی کتاب پبلشرز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: وسیم اقبال، محلہ، قاضی سرائے اوّل، نگینہ، ضلع بجنور، یو۔ پی۔

بنجاروں کی طرح خانہ بدوش زندگی بسر کرنے والے ''موگھیا'' جنھیں اتر پردیش میں ''بھیلیا'' کہا جاتا ہے، اتر پردیش، بہار، بنگال، اڑیسہ، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ خانہ بدوش زندگی گزارنے کے سبب ان کی صحیح تعداد معلوم کرنا آسان نہیں۔ یہ لوگ بڑے مشاق شکاری ہوتے ہیں اور عام طور پر کاندھوں پر تھیلا لٹکائے شہر شہر بھیڑ اکٹھا کر کے پہاڑی جڑی بوٹیوں سے بنائی ہوئی دوائیں، مشک، زعفران اور سلاجیت وغیرہ فروخت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس برادری میں پنچ اور پنچایت کو بہت اہمیت حاصل ہے اور پنچایت کے فیصلوں پر سختی سے عمل ہوتا ہے۔ 1871 میں ایک قانون بنا کر برطانوی حکومت نے انھیں جرائم پیشہ اقوام کے زمرے میں شمار کیا۔ یہ قانون 1952 تک نافذ رہا۔ لیکن اب یہ آزاد زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی لوک کہانیوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ موگھیوں کی سماجی اقدار کسی طرح بھی نام نہاد مہذب اور شائستہ اقدار سے کم نہیں بلکہ ہمارے مہذب سماج میں جن اخلاقی قدروں کو پامال کیا جارہا ہے آج بھی موگھیا سماج ان پر نہ صرف یقین کرتا ہے بلکہ سختی سے عمل بھی کرتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ موگھیا نظامِ انصاف میں سبق آموز کہانیوں کی بہت اہمیت ہے ان میں جب کسی قسم کا ٹکراؤ یا نااتفاقی ہوتی ہے تو فوراً پنچایت طلب ہوتی ہے جس میں دونوں جانب کے پنچ شریک ہوتے ہیں۔ اس انصاف پسند پنچایت میں اس بات کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ چور کو چور اور بے ایمان کو بے ایمان کہہ کر نہ پکارا جائے۔ پنچایت کی کارروائی اس طرح شروع ہوئی ہے کہ الزام عائد کرنے والے فریق کا پنچ کوئی کہانی سناتا ہے اور دوسرے فریق کے پنچ اس سے متاثر ہو کر کہتے ہیں کہ ''دیکھو کیا پھول مارا ہے۔'' دوسرے فریق کے پنچ کو بھی اپنی صفائی میں کہانی سنانے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ان کہانیوں کو ''مثل'' کہتے ہیں جو مثال کا مخفف ہے۔ ان مثالوں کی بنیاد پر قبیلے کا سردار سبھی پنچوں کی خواہش کو مدِ نظر رکھ کر اپنا فیصلہ سناتا ہے جسے دونوں فریق تسلیم کر لیتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''موگھیا لوک کہانیاں'' موگھیوں کے طرزِ زندگی، ان کے رہن سہن، عقیدوں، توہم پرستیوں اور آدرشوں کی بہترین عکاس ہے۔ یہ کتاب پروفیسر پی۔آر۔ شکلا کی ہندی کتاب ''موگھیا لوک کتھائیں'' کا اردو ترجمہ ہے جو وقار صدیقی صاحب نے کیا ہے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے شائع کرایا ہے۔ ڈیڑھ درجن سے کچھ زائد موگھیا لوک کہانیوں پر مشتمل اس کتاب میں قبائلی زندگی کی بھرپور تصویر کشی ہوئی ہے۔ ان کہانیوں میں سچ اور جھوٹ، ایمانداری اور بے ایمانی، عقل مندی اور حماقت، وفاداری اور ریاکاری، نیکی اور بدی کے درمیان زبردست ٹکراؤ ملتا ہے اور بالآخر بے ایمانی پر ایمانداری کی اور بے وقوفی یا حماقت پر دانش مندی کی جیت ہوتی ہے۔ جس طرح موگھیوں کے رسم و رواج ہمارے لیے نئے، دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں اسی طرح ان کہانیوں کا ماحول اور پس منظر قبائلی زندگی کی طرح وسیع، بے تکلف اور مبہم جویانہ ہے۔ اس میں درندے، پرندے، دیو، بھوت، گاؤں، ندیاں، پہاڑ اور جنگل وغیرہ سب موجود ہیں۔ ایک طرف محنتی، ایماندار اور غریب لوگ ہیں تو دوسری طرف ٹھگ، بے ایمان، مال دار سیٹھ اور ساہوکار ہیں جو بڑی بے دردی سے ان کا استحصال کرتے ہیں۔ کہیں جانوروں، پرندوں اور درندوں کی شکل میں جدوجہد دکھائی گئی ہے تو کہیں انسانوں کی شکل میں ٹکراؤ بھی موجود ہے۔ کہیں مزاحیہ رنگ ہے تو کہیں طنزیہ انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔ غرض کہ یہ کہانیاں بچوں اور بڑوں دونوں ہی کے لیے موگھیا قبائلی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں۔

امید کی جاسکتی ہے کہ سبق آموز اور اخلاقی قدروں سے پُر کہانیوں پر مبنی یہ کتاب بچوں کی ذہنی نشوونما میں مفید اور کارآمد ثابت ہوگی اور ہندوستانی آدی

واسی عوامی ثقافت کا بہترین سرمایہ ثابت ہوگی نیز بچوں کے ادب میں قابلِ عوامی ادب کی کمی کو پورا کرے گی۔

بہار میں بچوں کا ادب (آزادی کے بعد)

مصنف: ضیاء الرحمٰن غوثی

صفحات: 416، قیمت: -/300 روپے

ناشر: محمد آصف، سنگم آفسیٹ پروسیس، 90، سوئی مارکیٹ، پھاٹک، نمک، حوض قاضی چوک، دہلی-110006

مبصر: محمد نوشاد عالم، 268، سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-67

اردو ادب میں ادب اطفال کا ماضی نہایت روشن رہا ہے اور آج کل اس سے جو بے اعتنائی برتی جارہی ہے اس کے نشانات پہلے نہیں ملتے۔ اردو میں صف اوّل کے کم و بیش تمام شعرا و ادبا نے ادب اطفال کی طرف خاص طور پر توجہ کی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، تلوک چند محروم، اسمٰعیل میرٹھی، نظم طباطبائی اور بیاں میرٹھی وغیرہ کے نام خصوصی طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ کئی نام ایسے ہیں جن کی ادبی شہرت ادب اطفال کی بنیاد پر ہی قائم ہے۔

ہمارے زمانے میں ادب اطفال سے عام طور پر بے اعتنائی برتی گئی ہے لیکن ہمارے کچھ ادبا و شعرا، اس کی طرف سے یکسر غافل بھی نہیں ہیں اور کئی رسائل بھی بچوں کے لیے شائع ہورہے ہیں۔ موجودہ دور میں جن اہل قلم نے ادب اطفال کی طرف خاص طور پر توجہ دی ہے ان میں ایک نام ضیاالرحمٰن غوثی کا بھی ہے۔

ضیاالرحمٰن غوثی اپنی ابتدائی عمر سے ہی بچوں کے ادب سے منسلک رہے ہیں انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی ہیں اور نظمیں بھی۔ انھوں نے بہار سے بچوں کے لیے ایک رسالہ ''مسرت'' بھی نکالا تھا جو بچوں میں بہت مقبول ہوا تھا۔ لیکن حالات نے ایسی کروٹ بدلی کہ غوثی صاحب دہلی منتقل ہوگئے اور اس رسالے کی اشاعت بند ہوگئی۔ غوثی صاحب نے بچوں کے لیے کئی کتابیں مرتب کیں اور جب دہلی حکومت کے جریدے ''دہلی'' سے منسلک ہوئے تو اس جریدے میں اردو پڑھنے والے بچوں کے لیے گوشے شائع کیے۔

زیر تبصرہ کتاب میں ریاست بہار میں اردو ادب کے تعلق سے ادب اطفال کی صورت حال اور اردو میں بچوں کے ادب میں اہل بہار کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم مصنف نے اس کا دائرہ صرف بہار ہی تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ہندوستان گیر پیمانے پر جائزہ لیا ہے۔ ''اردو زبان میں بچوں کا ادب ایک سرسری جائزہ'' کے عنوان سے ماضی و حال میں ہندوستان میں ادب اطفال کی صورت حال کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں بہار کی راجدھانی پٹنہ کے تاریخی سماجی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر بحیثیت مجموعی اردو زبان میں بچوں کے ادب کا ایک سرسری جائزہ لیا ہے۔ اگرچہ یہ جائزہ تفصیلی نہیں اور بچوں کے لیے لکھنے والے بہت سے اہل قلم نظر انداز ہوگئے ہیں۔ اس کے باوجود ایک تصویر نظروں کے سامنے ابھر کر آجاتی ہے۔ اس کے بعد کا موضوع، بہار میں بچوں کا ادب، آزادی کے بعد، اگلے مضمون میں انھوں نے اپنے مرحوم ماہنامے ''مسرت'' کے کنٹری بیوشن (contribution) کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اس کے مختلف شماروں سے کہانیوں، نظموں، مضامین اور کارٹونوں وغیرہ کا انتخاب شامل کیا ہے۔ کتاب کا ایک گوشہ بچوں کے محبوب اور اہم ادیب اور شاعر شفیع الدین نیر کی یاد میں سجایا ہے۔ جس جذبے سے یہ گوشہ مرتب کیا گیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

کتاب کے درمیانی صفحات میں جگہ جگہ بچوں کے ادب کے تعلق سے اردو کے اہم قلم کاروں اور مشاہیر ادب کی آرا کو شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کا انتساب، سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر عبدالکلام کے نام ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ابوالکلام نے یوم اطفال پر جو پیغام دیا تھا اور یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے قوم سے جو خطاب کیا تھا، اس کا اقتباس شامل کیا ہے۔

کتاب لیزر کمپوزنگ میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے جس کا سرورق بھی موضوع کا عکاس اور جاذب نظر ہے۔

جان پہچان (بچوں کے ادیبوں اور شاعروں سے انٹرویو)

مصنف: رئیس صدیقی

صفحات: 128، قیمت: -/100 روپے

ناشر: تخلیق کار پبلشر، 104/B، یاور منزل، 1 بلاک، لکشمی نگر، دہلی-92

مبصر: رئیس الدین رئیس، 10/1725، دہلی گیٹ، علی گڑھ

بچوں کے ادب کے ابتدائی دور کے فنکاروں میں سرسید، حالی، محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی اور اقبال کا نام لیا جاسکتا ہے۔ بعد کے دور میں بہت سے نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے تواتر سے لکھا جیسے محمد شفیع الدین نیر، وکیل نجیب، اطہر افسر، احمد جمال پاشا، سعادت صدیقی، قدیر جاوید پرکی، کیف احمد صدیقی، شکیل جاوید، ظہیر نیازی، سلمان عباسی، خیال انصاری، اظہار اثر، مظفر حنفی اور بہت سے دوسرے۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بچوں کے ادب کی طرف ہمارے بڑے فنکاروں نے توجہ دینا کسر شان ہی سمجھا ہے کیوں کہ ادب میں بڑوں کے ادب کو جو

اعزاز حاصل ہے وہ بچوں کے ادب کو حاصل نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا آسان نہیں خاصا دشوار کام ہے۔ بچوں کے لیے لکھتے وقت ضروری ہوجاتا ہے کہ کہانی ہو یا نظم اس کی زبان سادہ وسلیس ہوتا کہ بچے روانی سے پڑھ سکیں۔ اس کے علاوہ موضوع ومضامین سبق آموز ہونے کے دلچسپ بھی ہونے چاہئیں۔ خشک قسم کے پندونصائح پر مبنی چیز میں بچے شوق سے نہیں پڑھیں گے۔

رئیس صدیقی کو تعلیمی زمانے سے ہی بچوں کے لیے لکھنے کا شوق رہا۔ بچوں کے لیے ان کی کہانیاں اس وقت کے بچوں کے مقبول رسائل کھلونا، پیام تعلیم، نور وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ وہ آج بھی بڑوں کے علاوہ بچوں کے لیے بھی لکھنا جاری رکھے ہوئے ہیں اور بچوں کے لیے ان کی پانچ کتابیں منصۂ شہود پر آکر مقبول ہوچکی ہیں" جان پہچان" ان کی تازہ کتاب ہے۔ جس کا اختصاص یہ ہے کہ یہ بچوں کے ادیبوں کے انٹرویو پر مبنی ہے۔ اس کام کے لیے انھیں در در کی خاک چھانی پڑی اور یہ کام بچوں کے لیے لکھنے سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ محمد شفیع الدین نیر کا انٹرویو ہمیں بتاتا ہے کہ موصوف نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں جدوجہد سے کام لے کر اپنی زندگی بنائی تھی۔ ان کی باتوں سے ہمیں عزم اور حوصلے کا سبق ملتا ہے۔ ادب میں کس کی رہنمائی زیادہ مؤثر ہوتی ہے؟ رئیس صدیقی کے اس سوال پر مشہور ظرافت نگار احمد جمال پاشا فرماتے ہیں۔

"بھئی حقیقت میں سب سے زیادہ رہنمائی تو میری کھوپڑی نے کی ہے۔ اس کے علاوہ کاغذ، قلم اور روشنائی نے بھی رہنمائی فرمائی ہے۔ ویسے میرے خیال میں ادیب کسی کی رہنمائی سے نہیں بلکہ اپنے مطالعے، مشاہدے اور محنت سے ہی بنتا ہے ورنہ بناسپتی ادیب ہوتا ہے۔" اظہار اثر سے انٹرویو کے دوران رئیس صدیقی کے سوال کے جواب میں اظہار اثر کا یہ حیرت انگیز انکشاف کہ:

"رئیس صاحب! اب تک ہزار سے زیادہ انگریزی ناولوں کے ترجمے کر چکا ہوں، پانچ سو سے زائد افسانے، ستر سے زائد ریڈیو کے لیے ڈرامے، ٹی وی۔ کے لیے سیریل اور اسٹیج کے لیے ڈرامے لکھ چکا ہوں اس کے علاوہ غزلوں اور نظموں کے دو مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔"

ڈاکٹر مظفر حنفی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"میں نے جب سے قلم اٹھایا ہے بچوں کے لیے لکھ رہا ہوں۔ بڑوں کے لیے خامہ فرسائی تو بعد میں کی ہے۔"

غرض کہ ان انٹرویوز میں جہاں بچوں کے لیے کیوں لکھا؟ کتنا لکھا اور بچوں کے ادب کا فروغ کیسے ہو؟ جیسے سوالوں کے جوابات ملتے ہیں وہیں قلمکاروں کی زندگی اور ان کے فن سے متعلق حیرت انگیز انکشافات کا اظہار ہوتا ہے اور اس کتاب کی اہمیت بڑھا دیتا ہے۔

تیز ہوا کے جھونکے

شاعر: ظفر انصاری ظفر

صفحات: 144، قیمت: -/250 روپے

ناشر: علمی مجلس، پٹنہ، بہار

یہ ظفر انصاری ظفر کی 2000 سے 2008 تک کہی گئی غزلوں کا مجموعہ ہے، جو بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے، اس مجموعے میں نئی زمینوں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی زمینوں میں بھی غزلیں موجود ہیں جن میں تازہ کاری اور رمق موجود ہے اور روایت کی پاسداری کے ساتھ جدت طرازی کا میلان بھی پایا جاتا ہے۔ سادگی شاعر کے کلام کا اہم وصف ہے۔ اسی سادگی میں پُرکاری بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ عشق مجازی کے رنگ میں رنگی ان غزلوں میں عشق سے حاصل تجربات کی روشنی میں عصری صورت حال کی عکاسی بھی خوب ہوئی ہے یعنی معاصر سیاسی، سماجی و اقتصادی مسائل کی جھلک بھی ان کی بہت سی غزلوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ فن شاعری سے متعلق خود شاعر کا خیال ہے کہ:

"دل دکھنے کے بعد جو بات زبان سے ادا ہو جاتی ہے میرے خیال میں کامیاب شاعری ہے۔"

اس شعر سے بھی شاعر کے نظریے کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔

کچھ اکہرے شعر کی بھی ہے ضرورت اے ظفر
شعر کو حالاں کہ پہلو دار ہونا چاہیے

تنقید شعر

مصنف: پرویز احمد اعظمی

صفحات: 151، قیمت: -/150 روپے

ناشر: پرویز احمد اعظمی، 9-4-431/10/1، اکبر باغ کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد

کتاب تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، جو آندھرا پردیش اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ انتساب مصنف نے اپنے بیٹے ذیشان کے نام کیا ہے۔ تیرہ مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ مصنف کے گزشتہ سات آٹھ سال میں تحریر کیے گئے مضامین (جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں) کا انتخاب ہے، جس میں کچھ ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو طلبہ کی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر قلمبند کیے گئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی کتاب لائق توجہ ہے اور ادبی حلقوں میں یہ پذیرائی کی حقدار بھی، جو مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:

(1) دیوانِ غالب کی پہلی غزل: تفہیم وتجزیہ (2) غالب کی استفہامیہ

شاعری (3) اختر الایمان: تیسری جہت کا شاعر (4) چکبست کے کلام میں منظر و جذبات نگاری (5) آرزو لکھنوی کی غزل گوئی (6) عزیز لکھنوی کی غزل گوئی (7) یگانہ چنگیزی: ہم زبان آتش (8) اصغر گونڈوی کی غزلوں میں تصوف (9) شاد عظیم آبادی کی غزل گوئی (10) اقبال سہیل کی غزلوں میں فکری عناصر (11) بیسویں صدی میں اردو نظم کا فکری و فنی ارتقا (12) عہدِ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ (13) اردو شاعری میں محبوب کا بدلتا تصور۔

سلگتے خواب

شاعر: زاہد ٹانڈوی

صفحات: 200، قیمت: -/200 روپے

ناشر: زاہد ٹانڈوی، امام باڑہ، ٹانڈہ بادلی، رامپور، یو. پی۔ 244925

غزلوں پر مشتمل شعری مجموعہ ہے، جس میں شاعر کے حالاتِ زندگی بھی رقم ہیں، جن کو پڑھ کر شاعر کی اس ادبی کاوش کی داد دینے کو دل چاہتا ہے کہ ناسازگار حالات میں بغیر باضابطہ تعلیم حاصل کیے صرف شوقیہ تعلیم کے ذریعے اور کسی استاد کی مدد لیے بغیر اس شعری مجموعے کو منظرِ عام پر لائے، یہ غزلیں غزلیہ تہذیب کے دلنشیں۔ رنگوں کے ساتھ جمالیاتی حسن اور رومان آفریں جذبات کی بھی ترجمان ہیں اور شاعر کے حالاتِ زندگی کی عکاس بھی۔ بطور نمونہ ایک شعر پیش ہے

ہے مرے مدِ مقابل آفتاب
شام تک دیکھیں کہ ڈھلتا کون ہے

امید ہے کہ شائقینِ غزل شاعر کی اس ادبی کاوش کو سراہیں گے اور ادبی حلقوں میں شاعر کا کلام قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ہم کتنے ہاتھوں بکے

شاعر: بھگوان داس اعجاز

صفحات: 128، قیمت: -/100 روپے

ناشر: فانی بک ڈپو، جامع مسجد، دہلی۔6

پاکستان میں جمیل الدین عالی اردو دنیا میں دوہوں کے لیے مشہور ہیں۔ جمیل الدین عالی کے بعد اردو دنیا میں بھگوان داس اعجاز کو دوہوں کے حوالے سے شہرت ملی اور ادبی شناخت قائم ہوئی۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان کا دوہوں پر مشتمل شعری مجموعہ ہے، جو دہلی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ شاعر نے اس کتاب کو اپنے مرحوم بیٹے کمل کے نام منسوب کیا ہے۔ ان دوہوں میں النا کی اور ایک ایسی کسک ہے جو شیشے کی کرچ کی سی چبھن رکھتی ہے۔ اور فلسفیانہ موشگافیوں میں شاعر نے موت اور زندگی کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔

امید ہے کہ دوہوں کے شائقین اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اردو میں دوہوں کی کمی کو یہ کتاب پورا کرے گی۔

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی ربط پیدا کر کے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کر دیا ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ ''اسلوبیات'' کے ذریعے کلامِ فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت -/210 روپے

شکستِ پندار

مصنفہ: جین آسٹن، مترجم: عبدالعلیم قدوائی

انگریزی کی مشہور زمانہ ناول نگار کے ناول ''پرائیڈ اینڈ پریجوڈیس'' کا ترجمہ عبدالعلیم قدوائی نے کرداروں کی مناسبت کے لحاظ سے ''شکستِ پندار'' کیا ہے۔ یہ ناول پہلی بار 1813 میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس وقت کے انگلستان کے متمول اور متوسط طبقے کے سماجی رجحانات، معاشرتی الجھنیں، اخلاقی عیوب، روزمرہ کے حالات اور دیہی علاقوں کے دلکش قدرتی مناظر کی مصوری حقیقت پسندی کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس کا مطالعہ اس اعتبار سے بھی دلچسپ ہے کہ اس کے بہت سے معاملات اور حالات ہمارے ملک سے مماثل ہیں۔

صفحات: 341، قیمت -/216 روپے

سید مجیب الرحمٰن

ننھا پھدکو!

چڑیا اور چڑا شام کو گھر لوٹے تو اپنے بیٹے پھدکو کو نہ پایا۔ بی چڑیا رو پڑیں۔ ''یا اللہ میرا بچہ کہاں چلا گیا، اسے تو ابھی اڑنا بھی نہیں آتا۔'' بابا کا تو بس دل چاہ رہا تھا کہ پھدکو مل جائے تو اسے پیٹ ڈالیں۔ ''نامعقول پتا نہیں کہاں چلا گیا، جب اس سے کہتے ہیں کہ چلو ہمارے ساتھ دانہ چگنے چلو تو گھونسلے میں پڑا رہتا ہے اور اب نہ جانے کہاں نکل گیا ہے۔ اڑنا آتا نہیں، خواب اونچی اڑان کے ہیں۔''

چڑیا، چڑا اور ان کا بیٹا پھدکو شہر کے بیچ میں واقع ایک باغ میں رہتے تھے، جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ گول دائرے میں لگے نیم کے درختوں سے نہ صرف سایہ ہوتا تھا، بلکہ وہ نہایت حسین منظر بھی پیش کرتے تھے۔ انھی گھنے نیم کے درختوں میں سے ایک ہرے بھرے درخت پر چڑیا چڑے کا گھونسلہ تھا۔ بی چڑیا اور چڑے کو اپنے بیٹے پھدکو سے بہت محبت تھی۔ وہ تھا بھی بہت ہی پیارا۔ اڑنا تو آتا نہیں تھا، بس پھدکتا پھرتا تھا، اسی وجہ سے اس کا نام پھدکو پڑ گیا۔ ماں باپ کا لاڈلا ہونے کی وجہ سے بہت ضدی ہو گیا تھا۔ چڑیا اور چڑا نے اس سے بہت کہا کہ روزانہ صبح کو تھوڑی دیر کے لیے ہمارے ساتھ چلا کرو، اس طرح دانہ بھی چگ لوگے، اڑنا بھی آجائے گا۔ یوں بلی اور دوسرے شکاریوں سے بچنے کا طریقہ بھی سیکھ لوگے، مگر پھدکو تو اپنی مرضی کا مالک تھا۔ ماما، بابا نے آج بھی سختی سے کہا تھا کہ اکیلے باہر نہ جانا، کیوں کہ کل کچھ بلیاں باغ میں گھس آئی ہیں جو پرندوں کے چھوٹے بچے بہت شوق سے کھاتی ہیں، مگر جب ماما، اور بابا دوپہر کو کھانا کھلا کر باہر نکلے تو پھدکو بھی ان کے پیچھے پیچھے نکل پڑا۔ ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی...... اور یوں وہ ایک درخت سے دوسرے درخت پر پھدکتے پھدکتے بہت دور نکل گیا۔

''آہا کتنا مزہ آرہا ہے کھلی کھلی فضا میں۔ ماما، بابا تو بس ہر وقت روک ٹوک کرتے رہتے ہیں، اِدھر نہ جاؤ، اُدھر نہ جاؤ، ایسا کرو، ویسا نہ کرو۔ کیسا مزہ آرہا ہے۔'' ننھا پھدکو اچھلتا کودتا چلا جارہا تھا۔ کاش مجھے اڑنا آتا تو دور لگے آم کے درخت پر ضرور جاتا اور کوئل خالہ سے گانا سنتا۔ کتنا اچھا گاتی ہے وہ۔ پھدکو خیالوں ہی خیالوں میں کوئل خالہ کے پاس پہنچ گیا۔

''چلو خیر کوئی بات نہیں، چند دنوں کی تو بات ہے۔ اگر میں یوں روز سیر کے لیے آتا رہا تو بہت جلد اس قابل ہو جاؤں گا کہ یہ باغ کیا شہر کے تمام باغوں میں روزانہ سیر کے لیے جاؤں گا اور راستے میں مزے مزے کے کھانے کھاؤں گا۔'' اس خیال سے ہی اس کے انگ انگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''ارے واہ!!'' پھدکتے پھدکتے نیچے نظر جو پڑی تو ڈھیر سارا باجرا پڑا ہوا پایا۔ جوش میں آکر اڑنے کی کوشش کی تو میاں

پھدکو سیدھے زمین پر آ گرے۔ درد کے مارے ''ہائے ماما، ہائے بابا'' پکارنا شروع کر دیا۔ بالکل صحیح کہتے تھے ماما، بابا، اگر اڑنا آتا تو ایسا نہ ہوتا۔ پھدکو افسوس کر رہا تھا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بڑے ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ماما ٹھیک کہتی ہیں، لالچ بری بلا ہے۔ نہ لالچ میں آتا اور نہ تکلیف اٹھانی پڑتی۔ اب کیا کروں؟ تکلیف سے پھدکو کی بری حالت تھی، لیکن کرے تو کیا کرے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں سے ماما آ جائیں اور اپنے پروں میں چھپا کر کہیں کہ کوئی بات نہیں، ایسا تو ہوتا رہتا ہے اور بابا اس کے جسم کو سہلائیں۔ پھدکو کے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا، جب کچھ دن پہلے دانہ چگتے ہوئے پھسلنے سے اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔ پھدکو نے تکلیف سے نڈھال ہو کر سر زمین پر رکھ دیا۔ ''خوں......خوں......'' پھدکو نے آنکھیں کھولیں تو ایک موٹی تازی بلی کو سامنے پایا۔ پھدکو کا جیسے سانس ہی رک گیا۔ ابھی ایک مصیبت سے نجات نہیں ملی کہ دوسری مصیبت سر پر آ کر کھڑی ہوئی۔ لگتا ہے آخری وقت قریب آ گیا ہے۔

''آہاہا.........ہا......اب میں تمھیں کھاؤں گی۔ نرم نرم ہڈیاں اور تازہ تازہ گوشت، مزہ ہی آ جائے گا۔ خوں......خوں'' بلی چٹخارے لیتے ہوئے غرائی۔ پھدکو کا دل چاہا کہ زور سے چیخے، مگر آواز گلے ہی میں دب گئی۔ پھدکو اس وقت کو کوس رہا تھا، جب وہ اکیلا ماما بابا کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلا تھا۔ بابا کتنا صحیح کہہ رہے تھے کہ بلیاں باغ میں گھسی ہیں، جو بچوں کو بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔

''خوں خوں......'' بلی دانت نکال کر زور سے غرائی، تاکہ پھدکو کی حالت سے لطف اُٹھائے۔ اس کو پورا یقین تھا کہ وہ بہ آسانی اپنا شکار پکڑ لے گی کیوں کہ چڑیا کا بچہ جسے اڑنا بھی نہ آتا ہو اور وہ بھی زخمی حالت میں اکیلا پڑا ہو تو وہ کہاں جا سکتا ہے؟

''اے اللہ میاں! مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی، میں نے ماما، بابا کی نافرمانی کی ہے۔ میں نے ان کا دل دکھایا ہے۔'' پھدکو کو اپنی اگلی پچھلی تمام خطائیں یاد آ گئیں، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے دل ہی دل میں روتے ہوئے اللہ سے دعا مانگی ''آپ نے مجھے معاف کر دیا اور اس مشکل سے نجات دے دی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی ماما، بابا کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ ان کی ہر بات مانوں گا اور وہ جو کہیں گے، میں وہی کروں گا۔ مجھے معاف کر دیں نا! آپ تو بہت اچھے ہیں اور صرف آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔''

پھدکو آنکھیں بند کیے مسلسل دعا کیے جا رہا تھا، اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ موٹی تازی بلی اب اس کے بہت قریب آ چکی تھی۔ ''کیا تم نے پھدکو کو دیکھا ہے؟ پھدکو یہاں تو نہیں آیا۔'' پھدکو کو برابر والے درخت سے ماما کی آواز آئی۔ بس پھر کیا تھا، پھدکو زور سے پکارا ''ماما''۔

بلی پریشان ہو گئی کہ نیم جان بچے میں جان کہاں سے پڑ گئی، مگر اس کو کیا معلوم کہ یہ تو پھدکو کی دعا کا نتیجہ تھا۔

''ماما! میں یہاں ہوں، درحت کے نیچے زمین پر'' پھدکو پھر سے چلایا۔

چڑیا اور چڑے نے گھبرا کے نیچے دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ پھدکو نیچے زخمی پڑا ہے اور اس کے پاس ایک بلی بیٹھی ہے۔ ماما، بابا دونوں سے یہ برداشت نہ ہوسکا۔ وہ اڑتے ہوئے بلی پر جھپٹے اور اس کے سر پر زور سے چونچ ماری۔

ارے یہ کیا؟ پھدکو حیران رہ گیا، کیوں کہ ماما بابا ہی کیا، یہاں تو ساری چڑیاں جمع ہوگئیں اور بلی پر جھپٹ پڑیں۔ بلی یہ دیکھ کر گھبرا گئی اور لگی بھاگنے۔ سب چڑیوں نے اس کی خوب درگت بنائی، شاید باغ سے ہی باہر نکال دیا ہو، مگر پھدکو کو اس کی کیا فکر، کیوں کہ اب تو اس کے ماما، بابا اس کے پاس تھے۔ وہ بہت شرمندہ تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان سے کن لفظوں میں معافی مانگے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اس کی خوب پٹائی ہوگی۔ کیونکہ میں اسی کا حق دار ہوں۔ پھدکو نے سر جھکا لیا، مگر پھر پھدکو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ماما بابا نے اسے کچھ نہیں کہا، بلکہ ماما نے اسے اپنے پروں میں چھپا لیا اور بابا اس کے پیر کو سہلانے لگے۔ پھدکو کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

□□□

550, Hakim G Street, Churiwalan, Delhi-110006

دھوپ چولھا

مصنف: ایم. ایم. ہدیٰ / مترجم: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

توانائی کے بحران نے قدرتی وسائل کی طرف پھر سے انسان کی توجہ مرکوز کی ہے۔ دھوپ چولھا یا سولر کوکر کی ایجاد اس کی تازہ مثال ہے۔ اس کتاب میں دھوپ چولھا تیار کرنے کے سلسلے میں کیے گئے مختلف تجربات اور ان کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں دھوپ چولھا بنانے کا طریقہ اور کوکر میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی ہیں۔

صفحات: 100، قیمت-/38 روپے

اسّی دن میں دنیا کا سفر

مصنف: جولس ورن / مترجم: صفدر حسین

ایک بے حد دلچسپ ناول جس میں ایک اصول پسند اور اولوالعزم آدمی کی کہانی بیان کی گئی ہے جس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شرط لگائی تھی کہ وہ اسّی دن میں پوری دنیا کا سفر طے کرے گا۔ 20 ہزار پونڈ کی اس شرط کو جیتنے کے لیے اس نے اس سے کئی گنا زیادہ رقم خرچ کردی۔ لیکن کیا وہ شرط جیت سکا؟ یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 170، قیمت-/21 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل

حیوانات ہماری رنگ برنگی دنیا کے حسن و دلفریبی میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں بھی معاون ہیں۔ زیرنظر کتاب میں بڑے دلچسپ انداز میں مختلف قسم کے حیوانات مثلاً ڈائنوسور، ہرن، بلی، ہائیڈرا، جگنو، شیر اور چیتا وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ ایک بے حد دلچسپ کتاب جس کو بچوں کے ساتھ بڑے بھی پسند کریں گے۔

صفحات: 111، قیمت-/17 روپے

ایک ناؤ اور ... کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریح طبع کا ذریعہ ہیں وہیں ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مافوق الفطری عناصر کی پیش کش سے قطع نظر داستانوں میں ہماری سماجی و ثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔

صفحات: 148، قیمت-/18 روپے

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
02	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
03	عہدِ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
04	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
05	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
06	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
07	چولا راجگان	209.00	52.00
08	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
09	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
10	غرائب الجمل	76.00	19.00
11	گلشن بے خار	128.00	32.00
12	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
13	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
14	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
15	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
16	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
17	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
18	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
19	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
20	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
21	ابتدائی علمِ شہریت	47.00	12.00
22	انسانی ارتقا	70.00	18.00
23	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00
24	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد ـ6-1)	3400.00	850.00
25	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد ـ4-1 اور 8-6)	1790.00	448.00
26	جنت سنگار	180.00	45.00
27	کلیاتِ پریم چند (جلد 1 تا 24)	4071	1018.00

28	للو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
29	لغت ابجد شماری (جلد۔1، حصہ دوم) لغت ابجد شماری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)	387.00	97.00
30	مجموعہ نغز	268.00	67.00
31	مسدود راہیں	126.00	32.00
32	مثنوی بہرام وگل اندام	66.00	17.00
33	مولیئر	57.00	14.00
34	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
35	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
36	پشکن	60.00	15.00
37	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
38	قدیم ہندوستان میں شودر	82.00	21.00
39	قومی زبان	76.00	19.00
40	قواعد کیٹیلاگ سازی	268.00	67.00
41	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
42	سیر کہسار	167.00	42.00
43	طبیعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
44	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
45	تنقید عقل محض	158.00	40.00
46	تاریخ طبعی (جلد۔1)	43.00	11.00
47	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
48	تشریحی تصاویر	66.00	17.00
49	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
50	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔5-1)	431.00	108.00
51	تالستائے	46.00	11.00
52	اصول معاشیات	47.00	12.00
53	اتر پردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
54	وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت	118.00	30.00
55	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
56	وضاحتی کتابیات (جلد 1، 3-22)	2650.00	663.00
57	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
58	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00

59	عکس اور برعکس	128.00	32.00
60	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
61	دھوپ چولھا	38.00	10.00
62	اجارہ	131.00	33.00
63	فسانۂ آزاد جلد 1 تا4	1163.00	291.00
64	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
65	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	130.00	33.00
66	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
67	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
68	ارتقا کائنات انسان و دیگر مضامین	94.00	24.00
69	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
70	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
71	کائنات جلیل	80.00	20.00
72	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
73	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
74	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
75	پیائش ونقشہ کشی	85.00	21.00
76	قدیم تامل ناڈو میں عربی وفارسی	98.00	25.00
77	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
78	شہیدان آزادی (جلد اول و دوم)	213.00	53.00
79	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
80	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
81	سخنوران گجرات	77.00	19.00
82	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
83	تاریخ آصفی	58.00	15.00
84	اجرتیں	95.00	24.00
85	جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار	178.00	45.00
86	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2010 تک دی جائے گی۔

نوٹ: محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

17 نومبر کو حرمین ایجوکیشن سوسائٹی، دہلی اسکول ٹیچرز ایسوسی ایشن اور دہلی اردو اکادمی کے اشتراک سے دہلی میں اردو میڈیم کے سرکاری اور سرکار سے امداد یافتہ اسکولوں کے اول آنے والے طلبہ، صد فی صد نتائج حاصل کرنے والے اساتذہ، بہترین نتائج درج کرانے والے اسکولوں اور قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سنٹروں کے طلبہ کو اسناد، شیلڈ اور ٹرافیاں تقسیم کی گئیں۔ تصویر میں جناب اجے ماکن وزیر مملکت برائے امور داخلہ اسناد تقسیم کرتے ہوئے۔ ان کے ساتھ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کھڑے ہیں۔

اس موقعے پر اسکولوں کی طالبات نے کلچرل پروگرام بھی پیش کیے۔

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2009-11
Date of Publication : 24/11/2009
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA **Monthly, December 2009, Vol. 11, Issue: 12**
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے منعقدہ جلسۂ تقسیم اسناد میں سوسائٹی کے جنرل سکریٹری جناب فرید احمد، مہمانِ مکرم جناب اجے ماکن، حکومتِ ہند کے وزیرِ مملکت برائے امورِ داخلہ کو گلدستہ پیش کر کے ان کا استقبال کرتے ہوئے۔ تصویر میں نظر آنے والے دیگر حضرات ہیں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، جناب محمود ضیا میونسپل کونسلر، جناب نثار حسین سابق میونسپل کونسلر اور جناب جمیل الرحمٰن پرنسپل سرود یہ بال ودیالیہ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج۔

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL Editor: Dr. M. Hamidullah Bhat, Tel: 26103381, 26103938